اُردو نظم میں منظر نگاری، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

URDU NAZM MEIN MANZAR NIGARI,
TEHQIQI AUR TANQIDI JAEZA

فیکلٹی آف لینگویجز پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) اُردو

نگران:

پروفیسر ناشر نقوی

مقالہ نگار:

برکت علی نجار

(Established Under Punjab Act No 35 of 1961)

شعبۂ فارسی، اُردو و عربی

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

اگست۔ ۲۰۱۹

ملخص

منظر نگاری اس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی بھی منظر کی عکاسی کی گئی ہو۔ خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔ وہ شاعری جو ارضی فضائی اور بحری مناظر سے تعلق رکھتی ہے نیچرل شاعری کہی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر منظر نگاری کو ہم نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ منظر نگاری کے متعلق دور جدید کے نقادوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر بحث کی ہے انھوں نے ضمنی طور پر منظر نگاری کو بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ منظر نگاری کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب نے لکھا ہے کہ منظر نگاری کے لئے صرف محاکات ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں تخیل کا بھی ہلکا سا رنگ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح سے اصل منظر زیادہ دلکش ہو جاتا ہے۔

اردو کی نظمیہ شاعری عام طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے پہلا حصہ عالم خارج ہوتا ہے اور دوسرا عالم ذہن پہلے قسم کی نظم میں اکثر رزم، بزم جلسہ، جلوس، باغ، تصور، چمن، گلزار، سبززار، دریا، ہوا، بجلی، دن رات، چاند، سورج وغیرہ کے بیانات ہوتے ہیں۔ یہ خارجی شاعری بھی ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

اردو نظم میں منظر نگاری تحقیقی اور تنقیدی جائزہ موضوع کے تحت، اس مقالے میں تحقیق کے اصولوں کے تحت جائزہ لیا گیا ہے اور وہ نیچرل شاعری جو مناظر قدرت کے بیان سے وابستہ ہوتی ہے اس کی معنویت کو پرکھا گیا ہے۔ اس پرکھ میں منظر نگاری کے کلیدی رول کو خاص طور پر اُجاگر کیا گیا ہے۔ اردو نظم میں منظر نگاری سے متعلق اب تک کا یہ پہلا ایسا تجزیہ اور جائزہ ہے جو تحقیق و تنقید کے پہلو سے اردو ادب میں ایک نیا روشن دان ثابت ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اردو میں منظر نگاری سے متعلق جو کتابیں سامنے آئی ہیں اُن کی اپنی ادبی اہمیت ہے لیکن تحقیقی زاویہ سے زیر نظر مقالہ دلائل کے ساتھ پہلی بار سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مذکورہ موضوع کو پانچ بنیادی ابواب میں منقسم کیا گیا ہے

پہلا باب: یہ باب منظر نگاری کی معنویت پر مشتمل ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں منظر نگاری کی تعریف و توضیح تفصیل بیان کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں منظر نگاری ابتدائی دور سے ہی جاری رہی ہیں جس کا سلسلہ شاعری کی جملہ اصناف میں ضرورتاً شعرا کرتے رہے ہیں لیکن اردو نظم میں اس کا باقاعدہ آغاز انجمن پنجاب کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں انجمن کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔

دوسرا باب: یہ باب اردو شاعری میں منظر نگاری سے متعلق ہے اس باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے شاعری اور منظر نگاری کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ابتدائی دور سے متعلق ہے جس میں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے عہد سے غالب کی عہد تک مختلف شعری اصناف میں کی گئی منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے کو عبوری دور کا نام دے کر سر سید تحریک اور جدید نظم کی تحریک سے وابستہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں منظر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب: یہ باب اردو نظم کا آغاز وارتقاء ہے۔ اس باب کے بھی دو حصے ہیں اردو نظم کے محرکات اور ابتدائی نظم گو شعر۔ اردو نظم کے محرکات ادب برائے زندگی رہے ہیں جسے انگریزی میں Practical life of poerty بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس تحریک کے رہنما سر سید احمد خان رہے جنھوں نے ادب میں نئے شعور کا اضافہ کیا۔ نئے شعور کے باوجود اردو نظم میں منظر نگاری کا طور طریقہ روایتی رہا ہے جو سامع اور قاری دونوں کے ذوق کے مطابق جاری رہا۔

چوتھا باب: یہ باب اردو نظم میں منظر نگاری کی وضاحت سے متعلق ہے اس باب میں شعرا نے جو منظر نگاری کی ہے اس کی پرکھ، قدرت کی عکاسی اور فطرت کی عکاسی کے طور پر کی گئی ہے۔ اس باب میں مناظر قدرت کی عکس بندی جس میں دن اور رات کا بیان اور موسموں کے زیر و بم خاص طور پر شامل ہیں اُجاگر کیے گئے ہیں۔

پانچواں باب: یہ باب اردو کے نمائندہ شعرا کی نظموں میں منظر نگاری کے عنوان سے ہے۔ اس میں نظم کے جو نمائندہ شعرا ہمارے خاکے میں شامل کئے گئے ہیں اُن کی اہم نظموں میں منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اِن شعرا کی تعداد بارہ ہے جو اس طرح ہے نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، سرور جہاں آبادی، اسمعیل میرٹھی، علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، نظم طباطبائی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، اور اختر الایمان۔

زیرِ نظر مقالے میں عہد بہ عہد منظر نگاری کی روایت کو اہم نظموں کے اقتباسات کے ساتھ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے میرا یہ مقالہ منظر نگاری کے حوالے سے اردو نظم شناسی میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوگا۔

"اردو نظم میں منظر نگاری، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار:
برکت علی نجار

نگران:
پروفیسر ناشر نقوی

1. *Tareekh e Adab,Octuber-2017, Vranasi: ISSN: 232-0341.*

   Paper*: Faizahmadfaizkidakhlishairi ka tanqeedijaiza,(Page No.190 to 194)*
2. *Tareekh e Adab,Noverber-2017, Vranasi: ISSN: 232-0341*

   Paper*: Shairifitrat Josh miliaabadi,(Page No.158 to 163)*

فیض احمد فیض کی داخلی منظر نگاری کا سرسری جائزہ

فیکلٹی آف لینگویجز، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے سالانہ سیمینار میں پیش کیا جانے والا
مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی
(اردو)
نومبر ۲۰۱۸ء

نگراں
پروفیسر ناشر نقوی

مقالہ نگار
برکت علی نجار

شعبۂ فارسی، اردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب)

فیض احمد فیض کی داخلی منظر نگاری کا سرسری جائزہ

فیض احمد فیض کی نظموں میں منظر کشی، حسن اور احساس کی شدت ہمارے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔فیض نے اردو شاعری کو نئے الفاظ دیئے ہیں۔ان کی نظموں میں منظر نگاری اجاگر ہے مثلاً بہار، موسم، گل، صیاد، خزاں، شام صبح، سحر، گل چیں، شبنم، گل تر، زنجیر، قبا، آگ، مہتاب، فصل، دشت و دریا، زنداں، فراق، قافلہ، رقیب وغیرہ الفاظ اور پیکر نئے علامتی اور معنی و مفہوم پیدا کرتے ہیں۔فیض احمد فیض الفاظ شناسی کے استاد ہیں۔ان کی شاعری اچھی روایت کے سرچشموں سے فیضاب ہوتی ہے۔انھوں نے اردو نظم نگاری کو معنوی وقار اور ظاہری حسن دیا اور نظم کو اس سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظموں کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔اس طرح نظم نگاری کی تحریک زور پکڑتی گئی۔اردو شاعری کی بساط پر فیض نے جیتے جی اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے اس بارے میں فضیل جعفری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> ''فیض کی شاعری کی زبان ان تمام ہم عصروں کی شاعری کی زبان سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔فیض کی نظموں کا مطالعہ ہمیں بلیک سر کے قول کی یاد دلاتا ہے کہ اچھے شعراء پہلے سے موجود زبان کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی تخلیق معلوم ہو۔
>
> (چٹان اور پانی، صفحہ ۲۷)

فیض نے اپنی ایک نظم ''تنہائی'' کے عنوان سے لکھی ہے۔اس نظم میں سوگواری اور اداسی کی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔اس نظم کے چند اشعار بھی دیکھئے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا
(نقش فریادی، صفحہ۱۹۳)

اس نظم کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''پوری نظم کا ڈِکشن رومانیت اور غمِ جاناں سے مربوط ہے۔فیض کا احساس تنہائی اِس نظم میں افسردگی کا بھی حامل ہے یعنی کچھ تشویش اور ڈپریشن کا بھی عمل دخل مصرعوں سے زیادہ مصرعوں کے درمیان روشن ہے، جو طبعی یا oragnic ہے۔''
(فیض شناسی، صفحہ۱۳۶)

فیض کے شعری مجموعوں ''دست صبا''،''دستِ تہہ سنگ'اور''سر وادئی سینا''میں بھی بعض نظمیں ایسی ہیں۔جن کے موضوع عشقیہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی وسماجی ہیں۔''دستِ صبا''۱۹۵۳ء میں شائع ہوا جب وہ جیل میں تھے۔فیض احمد فیض کے جیل سے آنے کے بعد ان کا مجموعہ''زنداں نامہ'' منظر عام پر آیا۔اس میں قید و بند کی یادگار نظمیں ہیں۔ان کے اس مجموعے میں جو موضوعات ہیں ان میں احساسات کی شدت ہے۔فیض کی شاعری میں اعلیٰ مقاصد و بلند خیالات ملتے ہیں انہوں نے اپنی بعض نظموں سے مظلوموں کو تسلی دی ہے۔یہ خلوص انہیں سچائی کی وجہ سے حاصل ہوا۔بقول مجنون گورکھپوری۔

''فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں یکساں تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اور ان کے لئے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں نئ تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔''
(فیض کی شاعری، صفحہ۴۰)

فیض کی نظموں میں تمثیل نگاری ملتی ہے۔ان کی شاعری ترنم وموسقیت سے پوری طرح لبریز ہے۔اس کے علاوہ پرُ لطف تشبیہوں واستعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر کو تراشتے ہیں۔ان کے موضوعات میں آفاقیت ہے۔ان کی ہمدردیاں بھی نہایت وسیع ہیں۔وہ اپنی شاعری میں لفظوں کا دلکش انتخاب کرتے ہیں۔ان کی خالص انقلابی نظموں میں موسقیت اور وزن کا اتار چڑھاؤ ہے جو کلام کو دلکش فن پارہ بنا دیتا ہے۔فیض نے ایک نظم''بول'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں یہ سارے چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس نظم کے اشعار کچھ اس طرح ہیں۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے — بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا — بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکاں میں — تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے　　پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے　　جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک　　بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(نسخہ ہائے وفا، صفحہ ۸۱)

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فیض کے کلام کا جائزہ یوں لیا ہے:

''شاعری میں موضوع کو اِس طرح سمونا کہ شاعری موضوع اور موضوع شاعری معلوم ہونے لگے۔ بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا، بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا۔ ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسّر ہو۔

(فیض شناسی، صفحہ ۳۱)

فیض کی نظموں میں ''صبح آزادی'' ''۱۵ ۔اگست ۱۹۵۲ء'' ''نثار میں تری گلیوں پر'' ''میرے ہم دم میرے دوست'' ''شیشوں کا مسیحا'' ''سیاسی لیڈر کے نام'' ''رقیب سے'' ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' ''ایرانی طلبہ کے نام'' ''سوچ'' ''سرِ مقتل'' ''دو آوازیں'' ''لوح و قلم'' اور ''اے دلِ بیتاب ٹھہر'' وغیرہ انتہائی کامیاب نظمیں ہیں۔ ان کی ایک نظم ''شاعر لوگ'' کے نام سے ہے جس میں زمانے کا ذکر ہے۔

ہر اک دور میں، ہم ہر زمانے میں ہم　　زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے　　ساعتِ وصل کی سر خوشی کے لیے
دین و دنیا کی دولت لٹاتے رہے　　فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہوئے
جو بھی رستہ چُنا اس پہ چلتے رہے　　مال والے حقارت سے تکتے رہے
طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے　　ہم نے ان پر کیا صرف حق سنگ زن
اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی　　سب سے اوجھل ہوئے حکم حاکم پہ ہم
قید خانے سہے، تازیانے سہے　　لوگ سنتے رہے ساز دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے　　خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ
دُکھ بھری خلق کا دُکھ بھرا دل ہیں ہم　　طبع شاعر ہے جنگاہ عدل و ستم

(نسخہ ہائے وفا، صفحہ ۶۲۹)

فیض کی نظم نگاری سچائی اور انصاف کے ایوان میں نہایت متوازن ہے اور فکر و فن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ جو روایات اور تجربات، کی نئی دریافتوں کی مہر درخشاں ہے۔ فیض کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا

ہے۔اقبال کی طرح فیض بھی ایک پیامی شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک کے میر کارواں ہیں ان کی ابتدائی دور کی نظموں میں رومانی جذبات ملتے ہیں۔ان نظموں میں افسردگی اور غم کی جھلک کے باوجود تلخی، بیزاری اور شکست کی فضا ہے۔نقش فریادی کی ابتدائی نظموں ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو'' میں منظر نگاری کے نقش ہیں۔فیض کے دل میں مظلوم انسانوں کی ہمدردی کے جذبات صاف طور پر نظر آتے ہے۔وہ ایک ایسے عشق کے امین ہیں جو عام انسانوں کے درد کا احساس عطا کرتا ہے اور اہل زر کے مظالم پر ان کو اشکبار بناتا ہے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو	سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے	تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے	تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے	کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنس عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے	فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے	وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

(نقش فریادی، صفحہ ۲۰)

فیض اپنے فن کے تقاضوں کو ہمیشہ محفوظ اور ملحوظ رکھتے ہیں۔ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے مجازی عشق کو بھلا کر دنیا کے غم کو گلے لگایا۔اس لئے ان کی شاعری میں انقلاب اور ترقی پسند رجحانات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر اپنے دور کے حالات سے بھی مطمئن نہیں تھے۔وہ دولت کی مساوی تقسیم کے حامی تھی۔فیض احمد فیض چاہتے تھے کہ ایک غیر طبقاتی سماج قائم ہو۔وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہاں تھے جس سے یہ مقصد پورا ہو سکے۔وہ چاہتے تھے کہ محنت کش طبقے کو اپنا حق مل سکے اور ہر ایک شخص آسودہ زندگی بسر کر سکے۔یہی ان کے نظموں کا پیغام بھی تھا۔بقول آلِ احمد سرور:

> فیض کی زندگی کے حسن سے محبت اور اس کے پیچھے معنویت اور رمزیت کو پانے کی کوشش ان کے کلام کو وقیع اور برگزیدہ بناتی ہے۔اس کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔اِنسانیت کے اِس پرستار کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔
>
> (فیض شناسی، صفحہ ۲۲)

سماج میں پائی جانے والی ناآسودگی، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس نے فیض کے ذہن کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ان اثرات سے ان کے لہجے میں اداسی اور مایوسی پیدا ہوگئی یہی اثرات ان کے نظموں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔محبوب کے ساتھ ساتھ فیض کی شاعری میں غم روزگار بھی ہے اس غم سے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا ہوا ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات ہے
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

(نقش فریادی، صفحہ ۶۸)

سردار جعفری نے فیض کی منظر نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

فیض بڑے شاعر ہیں۔ کہ انھوں نے نئے images دِیئے ہیں، نیا انقلابی آہنگ دِیا ہے اور ان کے اِس انسانیت کی جدوجہد کے آہنگ میں پورے ایشیا، پورے عرب اور پوری دنیا کی تحریکِ آزادی شامل ہو جاتی فیض سے اُردو میں ایک نئے دبستانِ شاعری کا آغاز ہوتا ہے یہ جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کا حسین سنگم ہے جس نے اُردو شاعری کو دو آتشہ بنا دِیا ہے۔

(فیض شناسی، صفحہ ۳۲)

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کے شعری افکار میں ایک الگ مکتبہِ فکر ہے۔ اُن کی نظموں میں اُردو کی جادوگری بھی ہے اور حسن بھی۔ وہ فکری کہکشاں کے دائروں میں سات رنگ اُجاگر کر کے اپنے خیال کے منظر کو آفاقی بنانے کا فن جانتے ہیں۔

کتابیات

نمبر	مصنف/مرتب	کتاب کا نام	پبلیشر	سن اشاعت
۱	فضیل جعفری	چٹان اور پانی	ہمالیہ بک، ہاوس اورنگ آباد	۱۹۷۴ء
۲	فیض احمد فیض	نقش فریادی	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۴۳ء
۳	ڈاکٹر تقی عابدی	فیض شناسی	ادارہ سیاست حیدر آباد، انڈیا	۲۰۱۳ء
۴	حبیب رحمٰن چغتائی	فیض کی شاعری	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	۱۹۹۷ء
۵	فیض احمد فیض	نسخہ ہائے وفا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۸۶ء
۶	ڈاکٹر تقی عابدی	فیض شناسی	ادارہ سیاست حیدر آباد، انڈیا	۲۰۱۳ء
۷	فیض احمد فیض	نسخہ ہائے وفا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۸۶ء
۸	فیض احمد فیض	نقش فریادی	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۴۳ء
۹	ڈاکٹر تقی عابدی	فیض شناسی	ادارہ سیاست حیدر آباد، انڈیا	۲۰۱۳ء
۱۰	فیض احمد فیض	نقش فریادی	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۴۳ء
۱۱	ڈاکٹر تقی عابدی	فیض شناسی	ادارہ سیاست حیدر آباد، انڈیا	۲۰۱۳ء

شاعرِ فطرت جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری میں منظر نگاری

سالانہ سیمینار

۲۰۱۶ء

پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار	نگران
برکت علی نجار	ڈاکٹر ناشر نقوی
(ریسرچ اسکالر)	(پروفیسر)

شعبہ فارسی، اردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب)

شاعرِ فطرت جوش ملیح آبادی کی شاعری میں منظر نگاری

بیسویں صدی میں جس شاعرِ کو انقلاب، شاعرِ شباب اور پھر شاعرِ فطرت کے خطابوں سے یاد کیا گیا وہ شبیر حسن خان (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲) جوش ملیح آبادی ہے۔ جوش کی شاعری فطرت اور منظر نگاری کی بولتی تصویر ہے۔ خود جوش اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا ایک بہت بڑا فریب ہے جو اسلئے دیا جاتا ہے
کہ انسان اپنے وجود میں کمی اور آبادی کے تن وتوش میں اضافہ کرے میں
اعتراف کرتا ہوں کہ عشق کے بغیر میں آدمی نہیں بن سکتا تھا رب فطرت کی
سوگند آج بھی فطرت کا عاشق ہوں۔ ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر
کی ابتداء ہوئی تھی تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ کیا ہے کہ انہیں کس
نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے یہ سب کچھ کسی حکیم کا کارخانہ ہے اس کارخانے
کا میں ایک مزدور ہوں۔'' [۱]

(یادوں کی برات۔ صفحہ ۱۵،۱۴)

جوش فطرت کے بہت بڑے شیدائی تھے انہوں نے اپنی شاعری میں مناظر فطرت کو بنیاد بنایا ہے۔ بلکہ فطرت برائے فطرت کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جوش کی نظموں میں منظر کشی کا ایسا نورانی سیلاب نظر آتا ہے جو اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری ہے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے۔ کہ جوش اپنی نظموں میں وہ سارے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کا مشاہدہ دریا کے کنارے، موجوں کے اٹھنے ایک دوسرے سے ٹکرانے کے موقعے پر ہوتا ہے۔ اردو کے منظر نگار شاعروں میں جوش کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو مناظر سے لطف اندوز بھی کر دیتے ہیں۔ اور اپنی انوکھی اُن علامتوں کی سیر بھی کراتے ہیں۔ جن کا وہ اپنی شاعری میں ذکر کرتے ہیں۔ چاہے وہ گنگا و جمنا کے کنارے ہوں، تاج محل کے در و دیوار ہوں یا ہندوستان کے جنگلوں کے پرندے اور سبز زار ہوں جوش اپنے اشعار میں موسموں کا بڑے شگفتہ اور منفرد الفاظ میں جابجا ذکر کرتے ہیں۔ جو فطرت کی رنگارنگی سے قاری کو لطف اندوز ہونے میں مددگار ہوتے ہیں۔ ''ربودگی'' کے عنوان سے ایک نظم میں جوش نے جو منظر نگاری کی ہے وہ کچھ یوں ہے۔ '' [۲]

ہو چکا ہے غروبِ، مہر و منیر　　　سامنے اب نہیں کوئی تصویر

سامنے کا ہرا بھرا جنگل　　ہو چکا ہے نگاہ سے اُوجھل
کھوتی جاتی ہے ظلمتوں میں نظر　　بے کسی ہے گھنی کھجوروں پر
گُونج ہے بادلوں کی، وادی میں　　پڑ رہی ہیں بڑی بڑی بوندیں
اور یہ راز بھی نہیں کھلتا　　کہ مجھے انتظار ہے کس کا؟
(کتاب، شعلہ وشبنم۔ص ۱۰۸)

جوش کا قوتِ مشاہدہ گہرا اور تیز ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جوش نے جو خیالی تصویریں کھینچی ہیں وہ صداقت پر نظر آتی ہیں۔ ان کے منظر نگاری سے متعلق اشعار میں مبالغہ کم مشاہدہ زیادہ ہے۔ اسلئے ہر منظر کی تصویر صاف ستھری نکھر آتی ہیں۔ جوش کی منظر نگاری کی منفرد صفت یہ ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو متحرک کر دیتے ہیں۔ وہ منظر کشی میں ڈوب کر خوشبو اور شبنم کی نمی کا بھی بھر پور احساس کرا دیتے ہیں۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

فطری مناظر کی جو کیفیت اور پرُ جوش عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی نظیریں ہمارے ادب میں بہت کم ہیں۔ فطرت ان کے یہا سادہ ورق نہیں بلکہ بولتی گاتی ہوئی حقیقت ہے۔ جو ان کے جذبات کو جگاتی ہے۔ جوش قدرت کے مناظر کے عاشق ہیں۔ ان کے دل میں قدرتی مناظر ہلکی، پھلکی چٹکیاں بھی لیتے ہیں۔ اور گڑ گڑ اتے بھی ہیں۔ وہ فطرت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔[۳] (اردو نظم اور جوش ملیح آبادی، ص۔ ۲۰۱)

اردو کے جدید شاعروں میں جوش ملیح آبادی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے جدید شاعری میں بہت سے اضافے کئے ہیں۔ شاعرِ فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ جوش ایک ہی وقت میں شاعرِ شباب بھی ہیں۔ اور شاعرِ انقلاب بھی۔ انھوں نے جذباتی رومانی شاعری بھی کی ہے۔ اور حقیقت و واقعیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں منظر کشی کی تصویریں بڑی خوبصورت انداز سے نمایاں ہیں جوش کو ابتداء سے ہی فطری، مناظر سے والہانہ عقیدت رہی تھی۔ انھوں نے اپنے وطن سے دور ایک ''قصر سحر'' اس لئے تعمیر کرایا تھا۔ تا کہ وہ قدرت کے دلکش حسن اور فطرت کے جمیل مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس قصر سے متعلق ان کی ایک نظم کا یہ بند ملاخطہ ہو۔

چھوڑ کر انسان کو فطرت کا شیدا ہو گیا　　خوبی قسمت سے فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہمدم، سبزہ زار و کوہ صحرا ہو گیا　　دوست میرا چشمہ، گلزار و دریا ہو گیا
مجھ کو حلقے میں تبسم نے لیا خورشید کے

شامِ غم رخصت ہوئی جلووں میں صبح عید کے ''۴؎ (کتاب۔روح ادب صفحہ۲۴)

جوش کو منظر نگاری اور عکاسی پر قدرت حاصل ہے۔ بقول جعفر علی خاں اثر لکھنوی:

''جوش فطرت کے شاعر ہیں ان کے کلام میں آبشاروں کا جوش وخروش وترنم ہے
دریا کی روانی، موجوں کا تلاطم اور بادِ سحر کی نرمی ہے ان کی شاعری میں وہی بے
تربیتی میں ترتیب اور تنوع میں ہم آہنگی ہے جو فطرت کا لہجہ امتیاز ہے۔''۵؎

(اردو نظم اور جوش ملیح آبادی، صفحہ ۹۹)

جوش فطرت کے ذرے ذرے سے پیار کرتے ہیں انھوں نے انسان اور فطرت کی قربت کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے اور دونوں کی الفت خلوص اور پیار کو نظموں میں ڈھالا ہے۔ نظم 'چڑیا' کا یہ بند ملاخطہ ہو:

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آو   لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں بھی کبھی اُڑ کے بازو ہلاؤ   کبھی صاف چشمے میں غوطہ لگاؤ
یوں ہی پیاری چڑیو، ابھی اور گاؤ۔''۶؎

(شاعر آخرالزماں، صفحہ ۴۹)

جوش نے ماضی کے شعروادب سے بھی استفادہ کیا اور جدید رنگ وآہنگ سے بھی وابستگی اختیار کی۔ وہ شاعرِ انقلاب بھی کہلائے جاتے ہیں اور شاعرِ شباب بھی اور انہیں شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جلال کے ساتھ جمال بھی ملتا ہے۔ جوش کسی ایک نظریے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں کا مطالعہ کرنا کوئی آسان نہیں ہے۔ جدید نظم میں منظر نگاری خاص اہمیت کی حامل ہے اپنی نظموں میں جوش نے منظر نگاری میں کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ جزئیات نگاری میں بھی دلکش کیفیات پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ جوش کی نظم ''جنگل کی شہزادی'' کا یہ بند ملاخطہ ہو:

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں   اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا   اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا
کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے   دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر   نازک بدن، شکرلب، شیریں ادا، افسوس'' ۷؎

(کتاب، نقش ونگار۔ صفحہ ۲۹)

''جنگل کی شہزادی'' نظم بیانیہ تکنیک میں لکھی گئی ہے یہ جوش کی شاہکار نظم ہے۔ اس نظم میں جوش کے جمالیاتی حسن اور فطری عاشقانہ جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس نظم میں اجمیر سے جے پور کے مختصر سفر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے چلتے چلتے ٹرین ایک جنگل میں آ کر رکتی ہے جہاں ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی اس حسینہ کو جوش نے جنگل کی شہزادی کا خطاب دے دیا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر جوش بے ساختہ ٹرین سے اتر آتے ہیں

اس حسینہ کے پاس جا کر اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں۔ جوش اس کے حسن میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ اپنے گرد و پیش کو بھول جاتے ہیں جب شام ہونے پر یہ حسینہ چلی جاتی ہے تو شاعر کو ہوش آتا ہے اور جب وہ پلٹ کر دیکھتا ہے تو وہاں سے گاڑی بھی جا چکی تھی۔ اس نظم میں جوش کی منظر نگاری اپنے جوبن پر ہے۔ قدرت نے ان کے قلم کو منظر نگاری کا اعجاز بخشا ہے۔

جوش بیسویں صدی کے ایک فطرت شناس شاعر تھے جنہوں نے اپنی نظموں میں فطرت کے رنگا رنگ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ اپنی شاعری میں وہ مناظر قدرت کے زبردست دلدادہ اور عاشق نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں منظر نگاری کے مختلف تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جوش ہر وقت ہر جگہ فطرت کے حسین و جمیل نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سرسبز و شاداب کوہساروں، سبزہ زاروں اور ہر پل بدلتے ہوئے مناظرِ قدرت سے وہ متاثر ہوتے رہے۔ جوش کو پو پھٹنے کا منظر بہت پسند تھا اس لئے وہ، ہر صبح کی سیر پر چلے جاتے تھے۔ صبح کا حسین منظر انہیں بہت محبوب تھا اور ان حسین مناظر سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔

اردو نظم نگاری کی تاریخ میں جوش کے کلام نے موجودہ نسل کی ذہنی تربیت پر نمایاں اثر ڈالا۔ پچھلی چار دہائیوں کی شاعری میں جوش کے اسلوبِ فکر اور شعر گوئی کے بہت نمایاں اثرات جھلکتے ہیں۔ جوش کو حُسن پسندی اور خودی پسندی ورثے میں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حسن پرست فطرت نے انہیں ایک طرف شاہکار عشقیہ نظمیں تخلیق کرنے پر اُکسایا اور دوسری طرف ان کی انقلاب پسند اور باغی فطرت نے انہیں انقلابی اور باغیانہ نظمیں لکھنے پر آمادہ کیا ہے۔ شاعری کے میدان میں ان کی رہنمائی ان کے دل و دماغ نے کی ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ جوش کی شاعری میں منظر نگاری کے مختلف رنگ و آہنگ ملتے ہیں۔ جوش کی ایک نظم ''مالن'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

آ رہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی — مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی
بار بار آنکھیں اٹھاتی، سانس لیتی تیز تیز — رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی
پاؤں رکھتی نازِ شبنم کے قطروں کی طرح — سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو چونکاتی ہوئی۔ ''[8]

(اردو نظم اور جوش ملیح آبادی، صفحہ ۱۷۲)

جوش کو فطرت کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا۔ کبھی چڑیوں کی حرکات و سکنات تو کبھی آسمان پر چھائی ہوئی گھٹا، کبھی برسات کی رِم جھم، کبھی شفق کا منظر، کبھی دیہات کی گہما گہمی، کبھی بادِ صبح کی نرمی، تو کبھی دریا کی روانی اور موجوں کا تلاطم ان سب کی انہوں نے بڑی فنکاری اور ذہانت سے تصور کشی کی ہے۔ جوش نے فطرت نگاری کے فن کو نہ صرف عروج پر پہنچا دیا۔ بلکہ مناظر فطرت کو بڑے ہی دلکش اور دلآویز انداز میں پیش کیا۔ جس نے مُردوں میں جان اور جذبات میں طوفان پیدا کر دیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی مناظر فطرت کی عکاسی سے متعلق جوش کی پیشکش کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’جوش نے مناظر فطرت پر کثرت سے نظمیں لکھی ہیں ۔ایسی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔صبح وشام ، برسات کی بہار گھٹا، بدلی کا چاند ،ساون کے مہینے ، پچھلا پہر ،گنگا کا گھاٹ ، یہ تمام اشعار جوش کی نظموں میں ملتے ہیں۔‘‘ ۹

(اردو نظم اور جوش ملیح آبادی، صفحہ ۲۰۴)

جوش نے ان مناظرِ حسن کے بعض ایسے پہلوؤں کو بھی تلاش کیا ہے۔ جو حسن اور ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔انھوں نے فطرت کے مناظر کو صرف مناظر فطرت کی طرح نہیں دیکھا ہے بلکہ اس میں خیال اور نظریے کی جستجو بھی کی ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے مناظرِ فطرت کے بیان میں کوئی فلسفیانہ انداز نظر نہیں آتا بلکہ بیانیہ کا ایک بہاؤ ہے۔ وہ اسے ایک عام انسان کی طرح دیکھتے ہیں۔وہ انسان جو اِن مناظر سے دلچسپی لیتا ہے اور جس کے دل میں ان کو دیکھ کر مسرت کی لہرسی اٹھتی ہے۔جوش نے قدرتی مناظر کی جو ترجمانی کی ہے وہ عام انسان کے دل کو چھوتی ہے۔جوش کی شاعری میں مناظر فطرت کی ترجمانی اور ان کیفیات کی عکاسی کا پہلو غالب ہے جو ان مناظر کے ہاتھوں انسان پر طاری ہوتی ہیں۔یہی لمحے جوش کی شاعری کو پیدا کرتے ہیں۔مناظرِ فطرت میں وہ لمحے جو انسان پر لطیف کیفیات کو طاری کرتے ہیں اور جن سے انسان میں ذہنی طور پر بلندی پیدا ہوتی ہے جوش ان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ برسات کی شفق، چاندنی، برسات کی پہلی گھٹا، شام اور اس کی بزم آرائیاں، بھری برسات کی روح نظمیں مناظرِ فطرت سے متعلق اِن کی شاہکار ہیں۔ ان نظموں سے اس حقیقت کا انداز ہوتا ہے کہ جوش مناظرِ فطرت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔انھوں نے ان مناظر کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے ان کا مشاہدہ تیز ہے۔اس لئے وہ ان کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔فطرت کو جوش نے تفصیل و جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مناظرِ فطرت کی ان گنت تصویریں جوش نے بنائی ہیں ۔البتہ کہیں کہیں رنگ و بوئے یار کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے اور یہ بات بالکل فطری ہے یہ مناظر جوش کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ ان کو محسوس کرتے ہیں انھیں تو ان مناظر میں کھونا آتا ہے۔ وہ ان میں گم ہو جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ان کی نظمیں ’’ربودگی‘‘ اور گمشدگی‘‘ اسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں جوش نے مناظر فطرت کو بڑے ہی دلکش اور دل آویز انداز میں پیش کیا ہے مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جوش نے اپنی پہچان کے الفاظ ’شاعرِ انقلاب‘، اور ’شاعر شباب‘ میں اپنی منظر نگاری کے منفرد طرز سے ’’شاعر فطرت‘‘ ہونے کا بھی حق بجانب اضافہ کیا ہے۔

حوالہ جات

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	پبلیشر	سنِ اشاعت
۱۔	جوش ملیح آبادی	یادوں کی برات	روشن پرنٹرس۔ بک ہاوس، دہلی	۲۰۱۳ء
۲۔	جوش ملیح آبادی	شعلہ وشبنم	ہمالیہ بک ہاوس۔ نئی دہلی	۱۹۸۶ء
۳۔	شاہ فیصل	اردو نظم اور جوش ملیح آبادی	ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز،، دہلی	۲۰۱۰ء
۴۔	شاہ فیصل	اردو نظم اور جوش ملیح آبادی	ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز،، دہلی	۲۰۱۰ء
۵۔	ڈاکٹر فضل امام	شاعرِ آخر الزماں	ماڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہل	۱۹۸۲ء
۶۔	جوش ملیح آبادی	نقش ونگار	پرویز بکڈ پو، نئی دہلی	۱۹۷۵ء
۷۔	شاہ فیصل	اردو نظم اور جوش ملیح آبادی	ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز،، دہلی	۲۰۱۰ء
۸۔	شاہ فیصل	اردو نظم اور جوش ملیح آبادی	ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز،، دہلی	۲۰۱۰ء
۹۔	شاہ فیصل	اردو نظم اور جوش ملیح آبادی	ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز،، دہل	۲۰۱۰ء

نام: برکت علی نجار

نیٹ ریسیرچ اسکالر اردو، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

پتہ: میر گنڈ کشمیر 09797413633

Candidate Declaration

*I, **Barket Ali Najar** certify that the work embodied in this Ph.D. thesis is my own bonafide work carried out by me under the supervision of **Dr. Nashir Naqvi** (Professor) from August 2015 to August 2019 at Department of **Persian, Urdu & Arabic, Punjabi University Patiala**. The matter represented in this Ph.D. Thesis has not been submitted for the award of any other Degree or diploma in any other institute.*

I declare that I have faithfully acknowledged, given credit to and referred to the research workers wherever their works have been cited in the text and the body of the thesis. I further certify that I have not willfully lifted up some other's work, paragraphs, text, data, results etc. reported in the journals, books, magazines, reports, dissertations, thesis etc. or available at websites and included them in this Ph.D. thesis and cited as my own work. I also declared that I have adhered to all principles of academic honesty and integrity and have not misrepresented or fabricated or falsified any idea/data /fact/source in my submission. I understand that any violation of the above will be cause for disciplinary action by university.

***Date:**06/09/2019*
Place: Patiala

Barket Ali Najar

This is to certify that the above statement made by the candidate is correct to the best of my knowledge.

Dr. Nashir Naqvi
Professor
Deptt. Of Persian, Urdu & Arabic,
Punjabi University Patiala, Punjab.

انتساب..........

محبتوں کے پیکر رہنما

اور

سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر ناشر نقوی

اور

محترمہ فرح نقوی کے نام

فہرست ابواب

چوتھا باب:

اردو نظم میں منظر نگاری

(۱) قدرت کی عکاسی

(۲) فطرت کی عکاسی

پانچواں باب :

اردو کے نمائندہ شعراء کی نظموں میں منظر نگاری

نمائندہ شعرا کے نام

(۱) نظیر اکبر آبادی
(۲) الطاف حسین حالی
(۳) اسماعیل میرٹھی
(۴) اکبر آلہ آبادی
(۵) جوش ملیح آبادی
(۶) فیض احمد فیض
(۷) محمد حسین آزاد
(۸) سرور جہاں آبادی
(۹) علامہ اقبال
(۱۰) نظم طباطبائی
(۱۱) اختر شیرانی
(۱۲) اختر الایمان

ماحصل:

کتابیات

پیش لفظ

منظر نگاری فنون لطیفہ میں خاص اہمیت کے حامل ہوتی ہے یہ ایک طرح کی مصوری ہے۔شاعری میں تصور کا اظہار لفظوں میں کیا جاتا ہے۔شاعر ایسے الفاظ سے اپنے تصور کی عکاسی کرتا ہے کہ اُس کا عکس اس کے قاری اور سامع کے عکس سے مل جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں شاعر اپنی وسعتِ نظر کے ساتھ قدرت ،فطرت،فلکیات،ارضیات اور زندگی سے متعلق جتنے بھی مناظر ہیں اُن کو محسوسات کے ساتھ تصویر کے روپ سے پیش کرتا ہے۔منظر نگاری کے لیے محاکات بہت ضروری ہیں۔اور محاکات کی کامیابی کے لیے مشاہدہ فطرت کی ضرورت ہے۔مشاہدۂ فطرت پر مولانا حالی نے بھی زور دیا ہے اگر چہ یہ بات انھوں نے تخیل کے سلسلے میں کہی ہے۔مگر مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں۔

> شاعر کے لیے نیچر کا خزانہ ہر وقت کُھلا ہوا ہے اور قوت متخیلہ کے لیے اس کی اصلی غذا کی کچھ کمی نہیں ہے۔پس بجائے اس کے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کاغذ کی پھول پنکھڑیاں بنائے اس کو چاہیے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرت حق کا تماشہ دیکھے۔جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھول اور پنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں۔
>
> (مقدمۂ شعر وشاعری۔صفحہ ۱۵)

مناظر قدرت کا بیان اظہار جذبات کے لیے وہی کام دیتا ہے جو تصویر کے واسطے اس کا پس منظر یعنی Back Ground پس منظر کے بغیر، منظر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ تصویر کو اُبھارنے کا کام آتا ہے۔ اردو شاعروں کا اصل مقصد کسی جذبے یا خیال کا اظہار ہوتا ہے وہ کسی منظر کو تمثیل یا تشبیہ کے طور پر ضمناً پیش کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعروں نے زیادہ تر فطرت کو پس منظر بنا کر ہی اپنی شاعری میں منظر نگاری کی ہے اور اپنے اصل جذبے کو نمایاں کیا ہے۔ فطرت کا اصل استعمال ہمیں نظم کی مختلف اصناف میں ملتا ہے۔ اردو کے قصیدہ نگاروں کی منظر نگاری کا تعلق زیادہ تر مصنوعی اور رسمی تصویروں سے رہا ہے، انھوں نے فرضی مناظر کے نقشے اُتارے ہیں جس سے اُن کے ذاتی مشاہدے کی کمی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف مرثیوں میں میر انیس اور مرزا دبیر نے مناظر قدرت کے جو نقشے پیش کئے ہیں وہ کافی دلکش ہیں جب کہ اِن مرثیہ نگاروں کا اصل مقصد مناظر قدرت کی تصویر کشی نہیں رہا۔ بیسویں صدی کے شاعروں نے اپنی نظموں میں انسانی فطرت کو پس منظر بنایا ہے۔ اس لیے اُن کی منظر نگاری بڑی حد تک کامیاب ضرور ہے لیکن سچائی کی تراوزیہ پر یہ منظر نگاری پوری نہیں اُترتی۔

زیر نظر مقالہ اردو نظم میں منظر نگاری تحقیق اور تنقیدی جائزہ کے تحت میرا یہ کام منظر نگاری کی معنویت کو سمجھنے اور پرکھنے کی ایک کوشش ہے جس کے تحت میں نے شاعری میں منظر نگاری کے مقاصد یعنی لطف اندوزی، اظہار و وابستگی، تصویر کشی اور فطرت کی ہمدردی کے ساتھ مناظر فطرت اور مناظر قدرت کے درمیان باہمی تعلق کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس پرکھ کے لیے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے مجھے تحقیق کے لیے 'اردو نظم میں منظر نگاری تحقیقی اور

تنقیدی موضوع دیا اور اس موضوع کے لیے مندرجہ ذیل ابواب پر کام کرنے کی منظوری دی اس پر مجھے فخر ہے۔

پہلا باب: یہ باب منظر نگاری کی معنویت پر مشتمل ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں منظر نگاری کی تعریف وتوضیح تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں منظر نگاری ابتدائی دور سے ہی جاری رہی ہے جس کا سلسلہ شاعری کی جملہ اصناف میں ضرورتاً شعرا کرتے رہے ہیں لیکن اردو نظم میں اس کا باقاعدہ آغاز انجمن پنجاب کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں انجمن کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔

دوسرا باب: یہ باب اردو شاعری میں منظر نگاری سے متعلق ہے اس باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے شاعری اور منظر نگاری کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ابتدائی دور سے متعلق ہے جس میں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے عہد سے غالب کے عہد تک مختلف شعری اصناف میں کی گئی منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے ۔اس باب کے دوسرے حصے کو عبوری دور کا نام دے کر سرسید تحریک اور جدید نظم کی تحریک سے وابستہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں منظر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب: یہ باب اردو نظم کا آغاز وارتقاء ہے۔اس باب کے بھی دو حصے ہیں اردو نظم کے محرکات اور ابتدائی نظم گوشعر۔اردو نظم کے محرکات ادب برائے زندگی رہے ہیں جسے انگریزی میں Practical life of poerty بھی کہہ سکتے ہیں۔اس تحریک کے رہنما سرسید احمد خان رہے۔

جنھوں نے ادب میں نئے شعور کا اضافہ کیا۔ نئے شعور کے باوجود اردو نظم میں منظر نگاری کا طور

طریقہ روایتی رہا ہے جو سامع اور قاری دونوں کے ذوق کے مطابق جاری رہا ہے۔

چوتھا باب: یہ باب اردو نظم میں منظر نگاری کی وضاحت سے متعلق ہے اس باب میں شعرا نے جو منظر نگاری کی ہے اس کی پرکھ، قدرت کی عکاسی اور فطرت کی عکاسی کے طور پر کی گئی ہے۔اس باب میں مناظر قدرت کی عکس بندی جس میں دن اور رات کا بیان اور موسموں کے زیر و بم خاص طور پر شامل ہیں اُجاگر کئے گئے ہیں۔

پانچواں باب: یہ باب اردو کے نمائندہ شعرا کی نظموں میں منظر نگاری کے عنوان سے ہے۔اس میں نظم کے جو نمائندہ شعرا ہمارے خاکے میں شامل کئے گئے ہیں اُن کی اہم نظموں میں منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔اِن شعرا کی تعداد بارہ ہے جو اس طرح ہیں نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، سرور جہاں آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، نظم طبا طبائی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، اور اختر الایمان۔

ماحصل: ماحصل میں میں نے اپنے پانچوں ابواب کا اختصار کیا ہے اور یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ قدرت اور فطرت دونوں میں ایک باہمی تعلق اور تنظیم ہے۔فطرت کا تعلق انسان سے ہے اور قدرت کا خدا سے، قدرت کے ہر منظر کے پیچھے انسان کی اپنی فطرت پس منظر بنتی ہے بالکل اسی طرح جیسے اصل فوٹو کے لیے Back Ground ہوتی ہے۔ بظاہر دیکھنے والا اصل فوٹو کو دیکھتا ہے لیکن Back Ground اس فوٹو کی اہمیت کو مزید اُجاگر کرنے میں مددگار بنتا ہے۔قدرت کے مناظر بھی اپنے حسن میں لازوال ہیں لیکن اُن کا بیان شاعر اپنی استعداد اور فطرت کے مطابق ہی کر پاتا ہے شاعر اور سامع اپنی اپنی فطرت کے مطابق منظر نگاری کی تفہیم کرتے ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اردو کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، میرا تعلق قدرتی مناظر کے خطے کشمیر سے ضرور ہے لیکن نہ میری مادری زبان اردو ہے اور نہ میرے ماحول میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے کشمیر میں اردو ایک ثانوی زبان ہے جس کا تعلق بطور مضمون اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے جڑا ہوا ہے۔ ویسے بھی میں جس نوجوان نسل کا فرد ہوں وہ نسل پچھلے تیس برس سے بے سکونی کی شکار رہی ہے۔ کشمیر کے تعلیمی مراکز جغرافیائی اور سماجی طور پر سال میں پانچ، چھ مہینے ہی تعلیم کے لیے کھلتے ہیں باقی مہینے انتشار میں گذرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں سماجی کشمکش کے علاوہ معاشی بحران بھی میری نسل جھیل رہی ہے پھر بھی کسی نہ کسی طرح گزشتہ پانچ برس کے دوران میں نے ثابت قدم رہ کر اس تحقیقی کام کو انجام دیا ہے۔

مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میری تحریر میں وہ رچاؤ اور بہاؤ نہیں ہے جو اردو کے صاحبِ زبان اور اہل زبان کے علاقوں کا ہوتا ہے اس سلسلے میں میں نے اپنے محسن پروفیسر زمان آزردہ اور اپنے نگران پروفیسر ناشر نقوی کی مستقل تنبیہیں سنی ہیں۔ ان دونوں استادوں کی ڈانٹ کو میں Credit دوں گا کہ اِن کی ہی وجہ سے میں اپنا کام مکمل کر پایا ہوں۔

اس مقالے میں منظر نگاری کی معنویت، تعریف وتوضیح بھی ہے اور اردو کے ابتدائی دور سے موجودہ دور تک اردو نظم میں منظر نگاری کی جو روایت رہی ہے اس کا بھی محاسبہ کیا گیا ہے۔ اردو نظم کے آغاز وارتقاء پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور اردو نظم کے محرکات بھی بیان کئے گئے ہیں، اردو کے جن نمائندہ شعرا نے منظر نگاری پر توجہ مرکوز رکھی ہے اُن کا ذکر بھی اس مقالے میں شامل ہے۔

اپنے اس تحقیقی کام کو پورا کرنے کے لیے میں نے پنجابی یونیورسٹی سے پنجابی میں پر ویشکا

سارٹیفیکٹ کورس کیا ہے اس سے پہلے اسی یونیورسٹی سے میں نے اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔پنجاب میں قیام کے دوران میں نے مختلف لائبریوں سے استفادہ کیا جن میں، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، بھائی کاہن سنگھ لائبریری پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ کی لائبریری شامل ہے۔میں نے کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی لائبریری سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔پنجابی یونیورسٹی میں قیام کے دوران میں نے اردو میں نیٹ کا امتحان بھی پاس کیا ہے۔

زیرِنظر تحقیقی مطالعے کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے یہ شعور اور ہمت بخشی اور اپنے فضل وکرم سے یہ تحقیق مقالہ مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔سندی تحقیق کے ابتدائی مراحل میں نگران اور موضوع کا انتخاب بہت اہم ہوتا ہے اگر نگران رہنما ملنسار، شفیق، حلیم اور محسن ہو تو اسکالر کے لئے کسی بھی موضوع پر کام کرنا آسان ہو جاتا ہے

اللہ تعالی نے مجھے ایسا نگران عطا کیا جن میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔میری مراد پروفیسر ناشر نقوی سے ہے۔جنھوں نے مجھے جس علمی ،ادبی اور تحقیقی سر پرستی سے نوازا اور قدم قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔اپنے شعبہ کے دوسرے استاد ڈاکٹر رحمان اختر اور کا بھی شکر ادا کرتا ہوں جنھوں نے مفید مشوروں سے نوازا۔دوسرے اہم معاونین میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے خوش دیپ اور سردار امرت پال سنگھ کا بھی دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر تکنیکی اور دفتری رکاوٹ کو دور کرنے میں مدد کی۔

دورانِ تحقیق جن لوگوں نے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا ان میں میرے والد علی محمد نجار اور والدہ نرجس خاتون بھی شامل ہیں۔میں پنجابی یونیورسٹی کے منشی ہری اوم سے بھی شکر گزار ہوں جن کی

رہنمائی ،سر براہی اور دست شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہا۔اس کے علاوہ میری پانچ بہنیں جن میں طاہر علی ،سکینہ علی،شمیمہ علی ،شگفتہ علی اور انجمن علی کا مشکور وممنون ہوں کہ ان کی خواہشات اور نیک تمنائیں میرے ساتھ رہیں اور خصوصاً اپنے والد صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے ہر طرح کی مالی مدد کی ۔ریسرچ اسکالر دوستوں میں سید طیب رضوی، وکیل احمد شوپیان ،جتندر پال،سید حسن عباس،محمد شمس بریلوی ،اقبال احمد خواجہ ،عابد علی پرا،غلام رسول بٹ،بلال احمد تر ال اور ریاض احمد میر کے نام قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ میڈم فرح نقوی بھائی تابش نقوی اور رامش نقوی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی محبتوں سے نوازا۔

اس موضوع پر ابھی تک نہ کوئی تحقیق ہوئی ہے اور نہ کوئی باضابطہ کوئی تحقیقی کتاب میری نظر سے گزری ہے۔اس لئے بھی مجھے اپنے تحقیقی کام کے دوران مواد کی فراہمی اور تلاش میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

آخر میں مجھے اس بات کا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی ہے کہ ہر ممکن کوشش کرنے کے باوجود بھی یہ تحقیق حرفِ آخر نہیں ہے۔یہ امید کرتا ہوں کہ آئندہ آنے والے ریسرچ اسکالرس مزید تحقیقی گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔

برکت علی نجار

پہلا باب

منظر نگاری کی معنویت

(۱) تعریف وتوضیح

(۲) ادب میں منظر نگاری

منظر نگاری کی معنویت

منظر نگاری کا تعلق مناظرِ قدرت سے ہے۔قر آن شریف میں کائنات کے مناظر اور انہیں دیکھنے [کی دعوت دی گئی ہے۔قر آن میں منظر نگاری کی جو جھلکیاں دیکھنے کوملتی ہیں اُن پر خدا اقراء کہہ کرغور کرنے کی دعوت دیتا ہے چونکہ قرآنِ کریم ایک مقدس کتاب ہے ۔اس میں خدا کبھی زمین کی تصویر کشی کرتا ہے تو کہیں زمینی باغات کی تصویر کشی کرتا ہے اور کبھی باغ بہشت کی رنگا رنگیوں کا ذکر کرتا ہے اور کہیں طوفانی واردات کا بیان ہے۔اور کہیں بارش کی بجلی وآندھی کا تذکرہ ہے۔کہیں میدان حشر کی منظر کشی ہے۔اسی طرح دوزخ کی تصویر کشی بھی قرآن میں ملتی ہے۔

تعریف وتوضیح

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

''اور دیکھو وہ ہی پرور دگار حق ہے،جس نے زمین کی سطح پھیلا دی۔اور اس میں پہاڑ ،اور دریا بنا دیئے اور طرح طرح کے پھل بنائے اور پھر ان پھلوں کے دو دو قسموں کے جوڑے بنا دیئے،وہ رات کو دن سے ڈھانپ دیتا ہے دیکھو زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان میں انگور کے باغ ہیں کھیت بھی ہیں کھجور کے درخت بھی ہے اور ایک ہی جڑ کی کئی شاخیں نکلتی ہیں اور الگ الگ جڑوں سے نکلے ہوئے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر بعض پھلا ور ذائقے کے اعتبار سے برتری دیتے ہیں۔''

(سورہ رعد،آیت نمبر،۳۴)

زمینی باغات کے حوالے سے سورۂ میں منظر نگاری سے متعلق ارشاد ہے۔

''وہ ہی ہے کہ جس نے طرح طرح کے درختوں کے باغات پیدا کر دیئے۔ٹیٹو پر چڑھائے ہوئے جیسے انگور کی بیلیں اور تعبیر اس کے دیئے وہ درخت جو خود اپنے تنوں پر کھڑے ہوئے ہیں اور کھجور کے درخت جن میں مختلف قسم کے کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں انار کے درخت صورت اور شکل میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف۔''

(سورہ،العنام آیت نمبر،۱۴)

جنت کے باغ سے متعلق قرآن میں آیا ہے:

''اس کے لئے دو دو باغ اور درختوں کی ٹہنیوں سے ہرے بھرے میوؤں سے لدے ہوئے، ان دونوں میں چشمے بھی جاری ہوں گے ان دونوں میں یہ سب سے میوئے دو دو قسم ہوں گے ۔ یہ لوگ اُن فرشوں پر جن کے استر اطلس کے تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، دونوں باغوں کے میوئے اس قدر قریب ہوں گے کہ اگر چاہیں تو لگے ہوئے کھالیں اِن دونوں باغوں کے علاوہ دو باغ اور بھی ہیں دونوں نہایت ہی گہرے سرسبز و شاداب ہے ۔ اِن دونوں باغوں میں دو چشمے جوش مارتے ہوں گے اِن دونوں میں میوئے خرمے اور انار بھی ہے''

(سورہ،رحمٰن،آیت نمبر،۵۵)

بارش کے حوالے سے آیت ہے:

''اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اسے چشمے بنا کر زمین میں چلاتا ہے پھر اس کے ساتھ گوناگوں رنگوں کی روئیدگی پیدا کرتا ہے پھر خشک ہو جاتا ہے تو اس سے زورد یکھتا ہے۔ پھر اس سے چورا چور کر دیتا ہے۔''

(سورۃ ملک، آیت نمبر، ۲۱)

ایک جگہ اسی بارش کا یوں ذکر ہے:

'' کیا تم نے غور نہیں کیا ہے اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر ہم اس کے رنگا رنگ کے پھل نکالتے ہیں۔''

(سورہ الفرقان، آیت نمبر، ۲۷، ۲۸)

بجلی کی منظر نگاری:

'' بجلی اپنی چمک دکھاتا ہے۔اور پانی سے بھرے بوجھل بھی بادلوں کو پیدا کرتا ہے اور آسمان سے بجلیوں کو بجھتا ہے اور پھر اُسے جس پر چاہتا ہے گرا بھی دیتے ہیں۔''

(سورہ رعد، آیت نمبر، ۱۱)

ہواؤں کی منظر نگاری:

'' ہوؤں کی قسم جو پہلے دھیمی چلتی ہیں۔ پھر زور پکڑ کے آندھی ہو جاتی ہے اور بادلوں کو اُبھار کر پھیلا دیتی ہیں پھر اُن کو پھاڑ کر جدا کر دیتی ہیں۔''

(سورۃ المرسلت، آیت نمبر، ۹)

روزِ قیامت کی منظر نگاری:

''پھر جب تاروں کی چمک جاتی رہے گی اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔ جب پہاڑ کی طرح اُڑے اُڑے پھریں گے۔''

(سورۃ القاریہ،آیت نمبر،۱۰۱)

میدان حشر کی منظر نگاری:

''جس دن لوگ میدان حشر میں ٹڈیوں کی طرح پھیلے ہوں گے اور پھر پہاڑ دھنکی ہوئی۔''

(پارہ النمل،آیت نمبر،۴)

قرآن کا ارشاد ہے:

''اور دیکھو ہم نے دنیا کے آسمانوں کو ستاروں کی قندیلوں سے خوش نما بنا دیا۔''

(سورۃ القاریہ،آیت ۳۵)

اللہ رب العزت نے کائنات کے ہر ہر منظر کی پہچان بھی کرائی ہے اور اس کی منظر کشی بھی کی ہے۔اس منظر کشی سے ہی انسان خدا ،خودی اور خود کو پہچانا ہے۔یہ ہی منظر کشی انسان کی فطرت کا بنیادی حصہ بھی ہے جس کا بیان وہ تا حیات کرتا رہتا ہے۔اظہار کے وسیلوں میں ایک وسیلہ ادب بھی ہے جس میں منظر نگاری سب سے زیادہ ہوتی آئی ہے۔

ادب میں منظر نگاری

ادبی زبان میں منظر نگاری اس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی بھی منظر کی عکاسی کی گئی ہو۔ خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔انگریزی ادیبوں اور نقادوں نے بھی منظر نگاری کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے ہڈسن کے کے Treatment of Nature کے الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔اس کے علاوہ ای۔البرٹ بھی اس قسم کی شاعری کو Treatment of Nature تعبیر کرتا ہے۔وہ نیچرل کا اطلاق ان مناظر پر کرتا ہے۔

جو زمین ،ہوا،اور سمندر میں بکھرے ہوئے ہیں۔اس لئے وہ شاعری جو ارضی فضائی اور بحری مناظر سے تعلق رکھتی ہے نیچرل شاعری کہی جاسکتی ہے۔اسی بنا پر منظر نگاری کو ہم نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔

سرسید نے نیچرل شاعری کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ شاعری جو خیالی نہ ہو فطری ہو۔اور جو تصنع اور آورد سے پاک ہو۔سرسید نے ۷فروری ۱۸۷۵ء کو نیچر کے متعلق ایک مضمون بہ عنوان ''اُردو نظم'' لکھا اس مضمون میں بھی انھوں نے نیچرل شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۷۴ء میں لاہور میں جس مشاعرہ کی بنیاد پڑی تھی اس کو وہ ''نیچرل پوئٹری'' کا مشاعرہ سمجھتے ہیں۔وہ مولانا آزاد اور مولانا حالی کی مثنویوں کو نیچرل شاعری کے زمرے میں رکھتے ہیں۔مولانا آزاد کی مثنوی ''خواب امن'' اور مولانا حالی کی مثنویاں ''حب الوطن'' اور مناظر رحم وانصاف'' کو نیچرل شاعری کا نمونہ سمجھتے ہیں اور موضوع کے اعتبار سے نیچرل شاعری میں فطری مضامین کا ذکر ضروری قرار دیتے ہیں۔اس کے ساتھ سرسید نے اسلوب کے اعتبار سے بھی نیچرل

شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔

> حالی کی یہ دونوں مثنویاں ''بیان میں' زبان میں' آمد میں'
>
> الفاظ کی ترتیب میں' سادگی وصفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ
>
> یہ دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔''

(مقالات سرسید،صفحہ۱۲۱)

غرض کہ سرسید کے ذہن میں نیچرل شاعری کا مفہوم یہی تھا کہ جوشاعری موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے فطرت کے مطابق ہو'اس کو نیچرل شاعری کہنا چاہیے چونکہ مولانا حالی کی ذہنی تربیت بڑی حد تک سرسید کی منّت ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی مناظر قدرت اور وصف نگاری میں بھی فرق قائم کرتے ہیں۔ان کی نظر مناظر قدرت اور وصف نگاری مترداف الفاظ نہیں ہیں۔مولانا السلام ندوی وصف نگاری کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> ''اگر چہ غلطی سے اس کو مناظر قدرت میں داخل کر لیا گیا ہے لیکن در
>
> حقیقت وہ شاعری کی ایک مستقل صنف ہے مناظر قدرت انسان کے دل
>
> میں مسرت ،خوشی انبساط،خوف اورعبرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اس
>
> لئے اس میں صرف جذبہ انگیز چیزیں مثلاً چاندنی، برسات ، بہار کوہ وصحرا
>
> اور قبرستان وغیرہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن وصف نگاری کو تحریک جذبات
>
> سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔بلکہ اس میں صرف موجوداتِ عالم کی

حقیقت یا ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کیے جاتے ہیں۔''

(شعر الہند، صفحہ ۴۵۲)

مولانا عبد السلام ندوی نے نہایت واضح الفاظ میں بتایا دیا ہے کہ وصف نگاری میں مادی اور غیر مادی دونوں اشیاء کا ذکر کیا جا سکتا ہے مگر مناظر قدرت میں صرف مناظر کا ذکر کیا جاتا ہے۔لیکن مادی اور غیر مادی بیانات میں فرق قائم کرنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مادی اشیاء کے بیان کے لیے''وصف نگاری کا لفظ متعیّن کر لیں اور غیر مادی یا فطری مناظر کی مصوری کو''مناظر قدرت کے تحت رکھیں۔اس طرح سے وصف نگاری اور مناظر قدرت کے درمیان حد فاصل قائم کی جا سکتی ہے

مولوی عبد الرحمٰن کی رائے ہے کہ غالباً طلب۔تمنا۔استفہام وغیرہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کو عربی شاعر ابن رشیق وصف کے دائرہ سے خارج سمجھتا ہے اِن باتوں کو چھوڑ کر وہ ساری شاعری کو وصف میں داخل سمجھتا ہے مگر لطف بات یہ ہے کہ اس نے جو وصف نگاری کی مثالیں پیش کی ہیں ان کا تعلق مناظر و مرئیات سے ہے اسی بنا پر مولوی عبد الرحمٰن نے مراۃ الشعرا میں وصف نگاری کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

''وصف عام طور پر مناظر قدرت و مرئیات کی تصویر کو کہتے ہیں۔''

(مراۃ الشعرا،صفحہ ۲۵۵)

بہر حال وصف نگاری کے دائرہ میں مناظر قدرت اور دیگر مرائی اشیا بھی شامل ہیں مگر منظر نگاری کا تعلق خاص طور سے مناظر قدرت سے ہے اس لیے منظر نگاری کے مفہوم کو واضح اور جدا کرنے سے وصف نگاری کو مادی اشیاء کے لیے مخصوص کر دینے کی ضرورت ہے۔منظر نگاری کے مفہوم کو مولوی سید

امداد امام اثر صاحب نے بھی واضح کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

''شاعری دو قسم پر تقسیم پائی جاتی ہے یعنی شاعری سے متعلق عالم خارج جس سے بے زبان انگریزی آبجیکٹو کہتے ہیں۔ اس اول قسم کی شاعری میں جس کا نام راقم خارج رکھتا ہے ایسے بیانات پر مشتمل ہے۔ جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں اس قسم کی شاعری میں اکثر یہ بیانات زم، بزم، جلوس، تزک، احتشام بساتین، باغ، تصور، چمن، گلزار، سبزار، لالہ زار، چشمے، ہوا برق، باراں، برف، بحر، شام، روز، شب شمس، قمر، سیارے، بروج، ودیگر، خارجی اشیاء کے متعلق ہوتے ہیں۔

(کشف الحقائق۔ص ا ۷)

مولوی سید امداد امام اثر کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خارجی شاعری میں مادی مناظر اور فطری مناظر دونوں آجاتے ہیں ۔یعنی خارجی شاعری میں مادی مناظر اور فطری مناظر دونوں آجاتے ہیں۔یعنی خارجی شاعری میں بازار' جلوس' رزم' بزم' کی بھی منظر نگاری کی جاسکتی ہے۔اور باغ ' چمن' شفق اور چاند وغیرہ کی بھی تصویریں کھینچی جاسکتی ہیں۔اس طرح سے خارجی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں منظر نگاری بھی شامل ہے مگر سہولت اور وضاحت کے لیے ہم خارجی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ایک مادی اشیا کا بیان جس کا نام وصف نگاری رکھا جاسکتا ہے ۔دوسرے غیر مادی یا فطری کا اشیا کا بیان جس کو منظر نگاری ہی کہا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اقبال کی نیچرل نظموں میں جگنو۔صبح کا ستارہ ایک پرندہ اور جگنو اور ابر وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ یہ تمام موضوعات

نیچر یا فطرت سے متعلق ہیں۔اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان موضوعات کا تعلق نیچرل شاعری سے ہے جس کا نام ہم منظر نگاری بھی رکھ سکتے ہیں۔شیخ اکرام بھی نیچرل شاعری کا اطلاق مناظر قدرت کی شاعری پر کرتے ہیں چنانچہ وہ غالب کی شاعری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

''مرزا کی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ نیچرل نہیں۔ جب حالی نے نیچرل کی اصطلاح شعروشاعری میں یہ پہلی مرتبہ استعمال کی تھی۔تو انھوں نے اس سے وہ شاعری مراد لی تھی جو خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہواگر غالب کے کلام کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض نہیں معلوم ہوتا ہے مگر معترضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظر قدرت کی شاعری مراد لیتے ہیں''

(حکیم فرزانہ،صفحہ ۱۵۵)

اِن دلائل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مرئیات کے بیان کو خارجی شاعری کہا جاسکتا ہے۔اس خارجی شاعری کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک مادی اشیا کا بیان جس کو وصف نگاری سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔دوسرا غیر مادی یا فطری اشیا کا بیان جس کو منظر نگاری کہا جاسکتا ہے۔منظر نگاری کو ہم نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہاں اس امر کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ منظر نگاری کا مفہوم بہت وسیع ہے منظر نگاری کا اطلاق صرف اسی شاعری پر نہیں کیا جاسکتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔یعنی ہم منظر نگاری صرف Description of Nature کو نہیں کہیں گے بلکہ منظر نگاری اس ساری شاعری کو کہیں

گے جس میں مناظر فطرت کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں کیا گیا ہے ۔یعنی اس منظر نگاری کا مطلب Treatment of Nature ہےلیکن مناظر قدرت کے بیان کے علاوہ فطرت کے ذی روح ہونے کا تصور،فطرت کی انسان سے ہمدردی۔فطرت کی انسان سے بے اعتنائی۔فطرت کی خوشی میں شرکت ۔ فطرت میں انسان کے لیے جذبہ حترام۔مناظر فطرت کی انسان کی موجودگی سے الگ رونق،فطرت کا انسانی نغمہ سے متاثر ہونا،یہی نہیں بلکہ فطرت کے ذریعہ متصوفانہ،اورفلسفیانہ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ وغیرہ بھی منظر نگاری کے زمرہ میں شامل ہے۔

فطرت کا مفہوم

فطرت کا مفہوم بہت مبہم ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت کومختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے M.H.Niclson نے پروفیسر Love Joy کے حوالے سے لکھا ہے کہ فطرت کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایسے پیچیدہ لفظ کا واضح آسانی سے پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے مفکرین نے بھی لفظ نیچر یا فطرت کی تشریح کی ہے نواب محسن الملک نے نیچر کے مفہوم کو مندرجہ ذیل سطور میں بیان کیا ہے۔

یہ نیچر لفظ مشتق ہے لیٹن کے لفظ نیٹس سے جس کے معنی ہیں پیدا شدہ۔اس لفظ کے مختلف معانی سامنے آتے ہیں۔

پہلا۔ اُن صفات کا مجموعٔہ کوئی چیز مرکب ہو کر ایسی حیثیت رکھتی ہو کہ دیگر اشیا سے ممیّز ہو خاصیت جو پیدائش کے ساتھ پیدا ہو یعنی خاص بناوٹ

دوسرا۔ اصطلاحی معنی۔مہربانی،قسم،جنس،خصلت،

تیسرا۔ معینہ دوراشیا۔ معمولی ترتیب وواقعات۔ تعلق معلول کے۔

چوتھا۔ موجودہ نظام اشیاء۔ مجموعہ معلوم اور نتائج کا' عالم مادہ عقل مخلوق کائنات۔

پانچوں۔ اصطلاحی معنی مجوعہ اور ترتیب جملہ اسباب اور نتائج کی۔ وہ قوتیں جو کہ کسی ظہور اشیاء کی ممد ہوتی ہیں۔ خواہ جزأً وکلاً۔ وہ قوتیں سے کہ عمل پیدائش واقع ہوتا ہے۔ مجموعہ تمام ان قوتوں کا بابحیثیت تمیز اس عقل کل سے کہ جو بعدہ کائنات سمجھا جاتا ہے۔

چھٹا۔ فطرت، محبت یا ادب عظمت۔

ساتواں۔ مطابقت ان چیزوں سے جو کہ فطری یعنی نیچرل ہیں۔ بحیثیت تمیز ان چیزوں سے کہ جو مجموعی ہیں۔ یا اور سے قرار دی گئی ہیں۔ یا جو واقعہ تجربہ کے بعد ہوں۔ ان چیزوں سے جو کہ معمولی ہیں اور عموماً ہوتی ہیں

آٹھواں۔ فطرتی حالت یا اقتباس لباس (تہذیب اخلاق، صفحہ ۳۳۴)

تہذیب اخلاق کی پہلی جلد میں شامل اپنے مضمون میں محسن الملک فطرت کا جو مفہوم بتایا ہے وہ بہت وسیع ہے۔ اُن کے مطابق فطرت کے جلوے چاروں طرف روز ازل سے بکھرے ہوئے جو رہتی دنیا تک قائم رہیں گے ان جلووں کی آرائش میں انسان کا دخل نہیں ہے۔

فطرت سے مراد وہ ساری کائنات ہے جو ہماری ذات سے باہر ہے فلسفہ کے تصور کے ماننے والوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خارجی دنیا کا وجود ہمارے ذہن کا عکس ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا علم لاعلمی کے ذریعے ہوتا ہے۔

کائنات اور فطرت کا خارجی وجود ہے۔ فطرت ایسی شے ہے جس کو ہم اپنے حواس کے ذریعے

ادراک اور احساس کے ذریعے دیکھتے ہیں۔اس فطرت کے دائرے میں وہ تمام قدرتی مناظر داخل ہوتے ہیں ،غرض کہ فطرت کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ اس کا وجود خارجی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔اس طرح فطرت کے دائرہ میں وہ تمام قدرتی مناظر داخل ہوتے ہیں جو زمین فضااور سمندر بکھرئے ہوئے ہیں ۔آسمان بادل،قوس قزح،سورج،چاند،ستارے،بجلی ،ہوا ،آندھی، طوفان،سمندر دریا جھیل،تالاب آبشار،موج،گرداب،ساحل،پہاڑ، وادی،غار،میدان،کھ بجھاڑی وغیرہ،کوفطرت کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔اس علاوہ تمام چرندے،پرندے اور درندے وغیرہ بھی فطرت کے افراد ہیں میدان میں رنگینے والے کیڑے اور پانی کے اندر رہنے والے جانور فطرت کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

منظر نگاری کا پھیلاؤ

فطرت کا دائرہ وسیع ہے اس لیے منظر نگاری کا دائرہ بھی وسیع ہے۔یہ موضوع اپنے دامن میں مختلف علوم کو سمیٹے ہوئے ہے۔ان علوم سے سرسری طور پر واقفیت رکھنا بہت ضروری ہے تاکہ ہم کو مختلف مناظر کی اہمیت کو سمجھ سکیں کہ کس شاعر نے اپنی منظر نگاری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔منظر نگاری کے مطالعہ میں فلکیات کا مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے چونکہ شعرا کی نظر میں سورج چاند اور ستاروں کی دنیا حسین ہوتی ہے۔اس لیے وہ بار بار اس دنیا کا تذکرہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔اس بنا پر منظر نگاری سمجھنے کے لیے نظام شمسی کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔اس علم کے ذریعہ ہم کو ساخت' اس کا جائے وقوع' اس کی جدت اور اس کا اندازہ ہوتا ہے،اس کے علاوہ بڑے سیاروں کے متعلق بھی اس علم کے ذریعہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔مثلاً مشتری اور زحل بڑے سیارے ہیں ۔اور عطارد' زہرٗ مریخ'

چانداورزمین چھوٹے سیارے ہیں۔اسی طرح ستاروں کے بارے میں معلومات بھی منظریہ شاعری کوسمجھنے کا وسیلہ ہے۔

فلکیات کے مناظر

نظام شمسی کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔کچھ ستارے نیلے، کچھ سرخ اور کچھ سنہرے ہوتے ہیں۔ ستاروں کے علاوہ شہاب ثاقب کے بارے میں بھی معلومات ضروری ہیں۔کہکشاں تو اردوشعرا کے خیالات کی ملکہ ہےاس کے متعلق معلومات بھی بہت مفید ثابت ہوں گی۔مثلاً کہکشاں میں تقریباً ایک سو پچاس ہزار لاکھ ستارے موجود ہیں یہ سب ستارے اس قدر طول میں پھیلے ہوئے ہیں کہ جب روشنی ۳ لاکھ کلومیٹر فی سکنڈ کے حساب سے ایک لاکھ برسوں تک سفر کرتی ہے تو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچتی ہے۔

آسمان پر سب سے زیادہ حسین چاند ہے۔یہ چاند ہمیشہ سے شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔اس چاند میں سیاہ دھبے ہوتے ہیں جو کہ اس کے حُسن کو بڑھاتے ہیں۔ان دھبوں کے نام سمندر کے نام پر رکھے گئے ہیں یہ دوربین کے ذریعے سے ایسے چالیس ہزار داغ دیکھے گئے ہیں۔چاند پر ایک پہاڑ بھی نظر آتا ہے جس کا نام ''گرمیدی'' رکھا گیا ہے۔بہرحال شاعری میں نظام شمسی کی منظر نگاری ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔

نباتات کے مناظر

منظر نگاری کو سمجھنے کے لئے علم باغبانی اور علم بھی ضروری ہیں۔پھول اور پھل، باغ اور پودے

ہماری شاعری م کے گلشن میں بہار دکھاتے ہیں۔خصوصاً پھولوں کے تذکرے کے بغیر ہماری شاعری بےنور نظر آتی ہے۔شعرا گلاب لالہ،نسترن اور نرگس وغیرہ کا ذکر مختلف پیرایے میں کرتے ہے۔اس لئے ان پھولوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔یورپین منصفین نے اس قسم کی معلومات کافی فراہم کی ہیں۔جان سٹون نے ایک کتاب گریڈن لکھی ہے اس کتاب میں ہندوستان کے تقریباً پھولوں کا تفصیلی ذکر ہے۔اس قسم کی ایک کتاب flowers Vegetable sand ہے جس میں تقریباً ۲۲۲ پھولوں کے بارے میں معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔اس قسم کی کتب منظریہ شاعری کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

علم طیور کے مناظر

اردو شعرا نے فطرت اور منظر نگاری کے سلسلہ میں مختلف پرندوں کا بھی ذکر کیا ہے۔بلبل تو اردو شاعری کی روح رواں ہے۔کائل کی کوک بھی ہمارے جذبات کو بیدار کرتی ہے۔مور کی جھنکار بھی شعرا کو پسند ہے ۔طوطی ،شاما اور ہریل وغیرہ کا ذکر بھی اُردو شاعری میں آتا ہے۔اس لیے علم الطیور کا مطالعہ بھی منظر نگاری کے سلسلہ میں ضروری ہے۔پرندوں کے بارے میں ہم کو یہ معلومات اُن کتب سے حاصل ہوسکتی ہیں۔جو شکار کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ James W.Beat نے بھی Shiker Note For Notice لکھی ہے اس کتاب میں مختلف پرندوں کا ذکر ہے۔اس قسم کی ایک کتاب Mairise Tulloch نے بھی تصنیف کی ہے جس کا نام The All one Shikar Book ہے اس سے پہلے حصہ میں پرندوں کا ذکر ہے۔پرندوں کے علاوہ ہم کو مویشیوں کے بارے میں بھی علم ہونا چاہیے۔اس لیے علم الحیوان کا مطالعہ بھی منظریہ شاعری کو سمجھنے میں مفید ثابت ہوگا۔

منظر نگاری کے سلسلے میں ماہی گیری (Fishery) اور علم الکرم Entology کا مطالعہ بھی اہم ہے اگر چہ مچھلیوں اور کیڑوں مکوڑوں کا ذکر ہماری شاعری میں زیادہ نہیں آتا ہے مگر ہماری شاعری ان کے ذکر سے خالی بھی نہیں ہے۔اس لیے اِن علوم کا مطالعہ بھی غیر ضروری ہے۔

موسمیات کے مناظر

منظر نگاری کے سلسلہ میں موسمیات کا مطالعہ خاص طور سے اہم ہے۔آسمان کی کیفیات۔سورج کا ابر میں چھپ جانا۔بادلوں کا ہجوم،قوس قزح کا نمودار ہونا۔مختلف ہواؤں سے کا چلنا،ان بادلوں پر اثر ،سردی اور گرمی کا بڑھنا اور گھٹنا، یہ سب موسمیات کے حدود کے اندر میں داخل ہے۔اوران چیزون کا تذکرہ ہماری شاعری میں بار بار آتا ہے۔اس سلسلہ میں جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے۔اس علم کے ذریعہ ہم کوکسی ملک کے پہاڑوں، ندیوں،جھیلوں اورفصلوں وغیرہ کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اور یہ واقفیت ہم جغرافیہ کی کتب سے حاصل کر سکتے ہیں۔ہم کو منظریہ شاعری کو سمجھنے کے لیے طبقات الارض (Zology) کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔

بہر حال ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ منظر نگاری کا موضوع وسیع ہے۔اس لئے مختلف علوم کا مطالعہ اس سلسلہ میں ناگریز ہاجاتا ہے۔اس قسم کے مطالعہ کے بغیر منظر یہ شاعری کی روح تک ہم نہیں پہونچ سکتے ہیں۔منظر نگاری سے متعلق سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''منظر نگاری کے زمرے میں فلکیات کا مطالعہ شامل ہے۔چونکہ شعراء کی
> نظر میں یہ سورج، چاند ،اور ستارے کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے۔اس
> لیے وہ بار باراس دنیا کا تذکرہ اپنی شاعری میں کرتے رہتے ہیں اس بنا پر

منظر نگاری کو سمجھنے کے لیے نظام شمس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا، اس علم کے
ذریعے ہم کو سورج کی ساخت کا جائزہ لینا ہے جس سے اس کی جدت اور
اس کے جسامت کا انداز ہوتا ہے۔اس کے علاوہ بڑے سیاروں کے
متعلق بھی اس علم کے ذریعہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔مثلاً مشتری اور
زحل، بڑے سیارے ہیں اور عطارد، زہرہ، مریخ، چاند، اور زمین چھوٹے
سیارے ہیں۔اسی طرح ستاروں کے بارے میں معلومات بھی نظریہ
شاعری کو سمجھتے میں مددگار ثابت ہوں گی۔مثلا دوربین کے ذریعہ ستارے
تقریباً ایک ارب تک دیکھے گئے ہیں۔''

(اردو شاعری میں منظر نگاری، صفحہ ۳۵)

اُردو شعرا نے فطرت پرستی اور منظر نگاری کے سلسلہ میں مختلف موضوعات کا ذکر کیا ہے۔مناظر نوعیت کے اعتبار سے دو طرح کے ہیں زمانی اور مکانی۔زمانی مناظر سے مراد وہ نظارے ہیں، جن کا تعلق وقت سے ہوتا ہے چنانچہ اس لحاظ سے تغیر پذیر، آنی اور فانی ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس مکانی مناظر چونکہ خاص جگہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لیے عام طور پر دیرپا اور متغیر ہوتے ہیں

آخر ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ منظر نگاری کا موضوع وسیع ہے اسلئے مختلف اصناف شاعری کا مطالعہ اس سلسلے میں ناگریز ہوتا ہے۔اس قسم کے حوالوں کے بغیر منظر یہ شاعری کے تعریف کی روح تک ہم نہیں پہونچ سکتے۔

اہم شعری اصناف اور منظر نگاری

اردو شعرا نے مناظر فطرت کسی نہ کسی حوالے سے جلوہ گری کی ہے اکثر و بیشتر شعرا کا کلام اپنے باغوں، ستاروں، دریاؤں، آبشاروں، ندیوں، گلستانوں اور کاہساروں کے ساتھ جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔مناظر فطرت ایک موضوع کی حیثیت سے شاعروں کا محبوب نہیں بن سکا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر شعرا مناظر فطرت کو نہیں دیکھ پائے ہیں۔یا باقاعدہ طور پر مناظر سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔منظر نگاری بھی مختلف علامتوں کے طور پر آتے ہیں شعر و ادب میں مختلف اصناف سخن کا شمار ہوتا ہے جس میں غزل،مثنوی،مرثیہ،قصیدہ ،وغیرہ اہم ہیں۔یہاں ان اصناف میں منظر نگاری کا سرسری جائزہ لیا جائے گا۔

اردو غزل میں منظر نگاری

غزل ہماری شاعری کی قابل قدر صنف ہے۔غزل سے مُراد عورتوں سے باتیں کرنا ا، جب کہ صطلاحی معنی میں غزل سے مراد وہ نظم ہے کہ جس میں اخلاق اور تصوف عشق و محبت کے مضامین کا بیان ہوتا ہے۔غزل میں ہر شعر کا مضمون الگ ہوتا ہے لیکن غزلِ مسلسل بھی ہوسکتی ہے جس میں عام طور پر ایک خیال کا اظہار ہو۔

محمد قلی قطب شاہ غزل کے پہلے شاعر تھے جس نے اردو ادب میں فطرت پرستی اور منظر نگاری کی بنیاد ڈالی۔

گرجا ہے میگھ سر سے تازہ ہوا ہے بستان — پھولوں کی باس پایا بلبل ہزار داستان

اے خوش خبر صباتوں لے جاجواں قداں کن — چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پریستان

نرگس اپس پلک سوں جھاڑوں کرے شبستان　　اونو نہال پھولوں ہے جامِ شوے سو بادہ

(مرتبہ کلیات قلی قطب شاہ،صفحہ ۱۹۹)

دکنی شعرا منظر نگاری سے بہت قریب نظر آتے ہیں مذکورہ اشعار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ محمد قلی نے اپنے اشعاروں اور تشبیہات کے لیے مواد اکھٹا کیا ہے۔

شمالی ہند کے شعرا میں مظہر جاناں، شیخ مبارک آبرو، شاہ حاتم وغیرہ اہم ہیں۔ یہ دور ایہام گوئی کا ہے۔مظہر جاناں نے اردو شاعری کو ایہام گوئی سے پاک کیا ہے۔ وہ ایہام گوئی سے ہٹ کر فطری شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔مظہر جاناں فرماتے ہیں۔

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار　　ہائے بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور　　کیا قیامت ہے کہ مووٗں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس وگل کی دکھو کلیاں کھلی جاتی ہے سب　　پھر اِن خوابیدہ مستوں کو جگاتی ہے بہار

شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں　　ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

(میر وسودا کا دور،صفحہ ۱۲۰)

شمالی ہند میں میر وسودا کا عہد شروع ہوتا ہے جو اردو شاعری کا عہد زریں کہلاتا ہے۔میر تقی میر کی عشقیہ غزلوں میں مناظر قدرت کا بیان ہے۔دیگر شعرا کی طرح بہار وخزاں، برسات کا فطری حُسن وہ اپنی شاعری میں بھر پور رنگوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے

پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد وباراں ہیں

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں

آ گئے ہو مے خانے کو نکلو، عہد بادہ گُساراں ہے

(کلیات میر، دیوان پنجم، صفحہ ۳۷۲)

آپ کی شاعری میں بہار اپنے پورے کمال اور نکھار کے ساتھ اُبھرتا محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے وہ جو کچھ بھی محسوس کرے، ہنرمندی سے اس کا بیان کرے۔

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے

پورے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر

بلبل پکاری دیکھ کے، صاحب پرے پرے

(کلیات میر، دیوان پنجم، صفحہ ۳۷۴۔۳۷۳)

میر کی شاعری میں قدرتی مناظر نظر آتے ہیں۔ آپ کی منظر نگاری میں ایک ایسی تصویر جو آئینے کی طرح صاف ہے۔

گل گئے گلشن بوٹے ہوئے برہم گئے

کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

(کلیات میر، جلد دوم، صفحہ ۳۳۷)

باغ کو بے لالہ وگل دیکھ، کہتے تھے طیور

جھڑ گئے پت جھڑ میں اب کے ہائے کیا کیا آشنا

(کلیات میر، جلد دوم پنجم، صفحہ ۱۰۷)

گُو گل و لالہ، کہاں سنبل، سمن، ہم نسترن

خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

(کلیات میر، دیوان اول صفحہ ۱۲۱)

مرزا محمد رفیع سودا نے مثنوی، قصائد، ہجو، مرثیہ، شہر آشوب اور غزلیات وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی شاعری میں تنوع اور رنگا رنگی ہے غزل گوئی میں روایتی موضوعات ہجر وصال، حسن وعشق، عشق ومحبت اور تصوف گو ہر موضوع ملتا ہے مگر سودا کے ہاں غزل کے مزاج پر قصیدے کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ سودا کی غزلوں میں منظر نگاری کے چند اشعار دیکھئے۔

گل ہے اور بلبل ہے مستوں کا غل ہر طرف

دیکھئے گلشن میں کیا دھواں میں مچاتی ہے بہار

شاید عزمِ یار کی گلشن میں پہنچی ہے خبر

گل کے پیراہن میں پھولے ئیں سماتی ہے بہار

(کلیات سودا، جلد اول، صفحہ ۶۳۴)

سودا نے مناظر کو مکمل طور پر پیش کیا ہے سودا کے یہاں منظر میں رنگ ہے اور خوشبو میں آواز ہے۔ یہ دونوں خوبیاں مل کر تصویر کا رنگ بھرپور رہی ہیں۔

ابر اُس کو بجھاتا ہے وہ بجھتی ہی نہیں سودا

دی لالہ خود رو نے یہ کہسار کو آتش

(کلیاتِ سودا، جلد اول، صفحہ ۶۲۳)

اُمدی بہار یارو، ہے رنگ ابر گہرا

ہم اور سنگِ طفلاں، یہ شہر اور صحرا

(کلیاتِ سودا، جلد اول، صفحہ ۲۵۹)

جتنے بھی کھلے پھول ہے اچھے نہیں لگتے ہیں جب تک بہار کی تمام رنگ رنگیاں محبوب کے دم قدم بھلی لگتی ہیں۔ ورنہ باغ میں کھلے پھول بھی اچھے نہیں لگتا۔ اِن پھولوں کے حوالے سے سودا کی منظر نگاری۔

گُو بہار آئی، کیسے سودا بھلا لگتا ہے باغ

یوں چمن میں گل نظر آتے ہیں جو گلغن میں آگ

کس نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا

لائی ہے بوئے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

(کلیاتِ سودا، جلد اول، صفحہ ۴۲۰)

خزاں کی منظر کشی بھی دیکھئے:

پوچھتے ہے پھول وپھل کی خراب اب تو عندلیب

ٹوٹے، جھڑ ئے ،خزاں ہوئی، پھولے پھلے گئے

(کلیاتِ سودا، جلد اول، صفحہ ۴۲۰)

نہ دیکھا اس کے سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا

گل ادھر لے گئے گلچیں گئی روتی، اُدھر شبنم

(کلیات سودا، جلد اول، صفحہ ۹۶)

شاہ نصیر نے قصیدہ، رباعی، مثنوی اور غزل وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے، دیگر شعرا اردو کی طرح نصیر کے ہاں بھی منظر نگاری کا بیان ملتا ہے۔

شبنم گلاب پاس لے غنچے کے ہاتھ میں
منہ پر گلوں کے چھڑکے ہے دھل دھل علی الصباح

(کلیات شاہ نصیر، جلد دوم، صفحہ ۴۴۶)

برسات کی منظر کشی:۔

جام جم دے مجھے ساقی کہ گھٹا اُٹھتی ہے
برق بھی سر پہ یہ اب لے کے پٹا اُٹھتی ہے

(کلیات شاہ نصیر، جلد دوم، صفحہ ۱۷۶)

خواجہ حیدر آتش کے کلیات میں ۶۱۳ غزلیات ہیں۔آپ کے غزلیات میں ہر ایک شعر کا رنگ ملے گا۔ وہ خود کو مرصع ساز کہتے ہیں مگر اس مرصع ساز سے پہلے وہ ایک اچھے مصور بھی ہے جو منظر نگاری کے حسین مناظر کو تراش کر جڑتے ہیں۔

کیا چمن شگفتہ ہیں، کیا بہار آئی ہے
کیا دماغ بُلبل میں بوئے گُل سمائی ہے

(کلیات آتش، صفحہ ۳۷۴)

رنگ لائی چہرہ گُل پر نسیمِ نوبہار

اپنی اپنی زمزمہ سنج چمن گانے لگے

(کلیات آتش، صفحہ ۳۳۳)

دکھلائے گا بہار کو حُسن اپنا باغیاں

آئینہ آب جُو کا لگایا چمن میں ہے

(کلیات آتش، صفحہ ۳۳۳)

بہار لالہ وگُل سے لگی ہے آگ گلشن میں

گریباں پھاڑ کر چل بیٹھے صحرا کے دامن میں

(کلیات آتش، صفحہ ۳۹۷)

مذکورہ اشعار میں آتش نے بہار کی تصویر پیش کی ۔اس بہار سے لطف اُٹھانے کے لئے محبوب کی قربت بھی بہت معنی رکھتی ہے۔یہی آتش کے منظر نگاری کا ثبوت ہے۔

فصل گل ہے، یاد آتی ہے مجھے رفتارِ یار

چلتی ہے بَن بَن کے کیا بادِ بہاری اِن دنوں

(کلیات آتش، صفحہ،۳۵۶)

شیخ امام بخش ناسخ کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ناسخ کا تعلق دبستانِ لکھنو سے ہے۔ناسخ نے رباعی،مخمس،مثنوی اورغزل میں طبع آزمائی کی ہے۔اُن کے کل غزلیات کی تعداد۹۰۷ ہے ۔ناسخ کی شاعری کے دو رنگ ملتے ہیں۔ پہلا رنگ مضمون آفرینی اس میں شعر سجا کر پیش

کرنا، دوسرا رنگ سخن، کہ جس میں جذبہ واحساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے، باغ و بہار جو ہماری شاعری کا موضوع ہے۔ اگر ہمیں قدرت کا حسن دیکھنا ہو تو بہار میں باغ کا منظر بھی دیکھنا ضروری ہے۔ ناسخ کے چند شعر بھی دیکھئے، جس میں یہ ساری خوبیاں ہے۔آپ کی غزلیات کا بیشتر موضوع سراپا نگاری ہے۔ ناسخ اپنی شاعری میں فطرت اور محبوب کے حسن میں موزانہ نہیں کرتے بلکہ اشیاء فطرت کو کم تر اور حسن فطرت کو برتر بتلاتے ہیں۔ منظر نگاری کے حوالے سے چند اشعار دیکھئے۔

لالہ وگُل کا جوش ہے، بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے، موسم ناؤ نوش ہے
صدقہ ہو تیری چال پر کیوں نہ نسیم ہر سحر
نقش قدم سے رہگذر دامنِ گُل فروش ہے

(کلیات ناسخ، جلد دوم، صفحہ ۳۲۷)

ناسخ کی غزل میں منظر نگاری:

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے بلبلُوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
اگر چہ آئی ہے برسات پُھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولُوں کی

(کلیات ناسخ، جلد دوم، صفحہ ۱۲۴)

ناسخ کے ہاں روایتی اور کلاسکی انداز سے ہی منظر نگاری کا تمام جوبن محبوب کے دم قدم سے نظر آتا

ہے۔وہ فرماتے ہیں:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا ،خدا مہربان تھا

(کلیات ناسخ،جلد دوم،صفحہ۱۱۱)

مومن خان مومن کے کل ۲۱۹ غزلیات ہیں۔آپ کے غزلیات میں منظر نگاری کی عکاسی ہیں۔
مومن خاں مومن نے بھی بہار کے عنوان سے اپنے غزلوں میں اشعار لکھئے ہیں۔

کوہ وصحرا میں پئے فرحت پھراتی ہے بہار
میں تو کیا اُن کو بھی دیوانہ بناتی ہے بہار
کھل چکی نرگس شرمائی ہی جائی ہے بہار
دیکھ کر اُس کی بہار آنکھیں چراتی ہے بہار
آمد آمد ہے چمن میں کس سمن اندام کی
سبزہ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

(کلیات مومن،صفحہ ۹۲)

مرزا غالب کے دیوان میں تقریباً ۳۰۰ کے قریب غزلیں ہیں۔غالب نے بھی اپنی شاعری میں بہار کے عنوان سے اشعار لکھئے ہیں جن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پھر اس انداز سے آئی ہے بہار کہ ہوئے مہر و ما تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمین ہوگئی ہے سر تا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبز و گُل کے دیکھنے کیلئے چشم ِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

(دیوان غالب،صفحہ۱۴۱)

مذکورہ اشعار میں مرزا صاحب جس بہار کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ واتنی حسین ہے کہ مہر و ماہ اس کے تماشائی بن گئے اور ایسی ہے کہ اس کو عالم آرائی کہنا بجا ہوگا جہاں دیکھو ہر جگہ پر سبز و شاداب ہے اور جب زمین پر کوئی بھی جگہ نہ بچی تو پانی پر کائی کی صورت میں ڈھل گیا۔یہی غالب کی منظر نگاری کا ثبوت ہے۔

مثنوی میں منظر نگاری

قدیم شاعری میں مثنوی ایک اہم صنف ہے۔مثنوی نظم کے اس پیکر کا نام ہیں کہ جس کا ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر کے بعد قافیہ بدل جائے۔شاعری کی دو قسمیں ہیں۔اول قسم کی شاعری میں داخلی یا بیانہ یا غنائی اور دوم قسم کی شاعری میں خارجی یا بیانہ اول غزل کا اور دوم نے مثنوی کا ملبوس پسند کیا۔لیکن مثنوی محض کائنات کی مرقع کشی یا منظر نگاری نہیں کرتی بلکہ کیفیات واحساسات کی بھی ترجمانی وشرح کرتی ہے اردو منظر نگاری کے حوالے سے گیان چند جین فرماتے ہیں۔

''اردو میں منظر نگاری کے دو طریقے ہیں ایک کہ بیان میں حقیقت نگاری اور سادگی مرکوز خاطر رہتی ہے تشبیہ اور استعارے اگر ہوتے ہیں۔ تو

فریب الفہیم شاعری کی کوشش ہوتی ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے آجائے۔
دوسرے اسلوب میں تخیُل کی موشگافی اور مبالغہ کی بلند پروازی ہوتی ہے
استعاروں اور ضلع جگت کا طلسم ہوتا ہے اس طلسم سے صناعی کی نکتہ ایسی
مشاقی کا سکہ تو بیٹھ جاتا ہے۔لیکن اصل منظر نظر سے پوشیدہ رہتا ہے۔

(اردو مثنوی شمالی ہند میں،صفحہ ۸۴)

اردو مثنویوں میں منظر نگاری کثرت سے ملتی ہے۔رزم بزم مثنوی کا موضوع ہے قدیم شاعری میں منظر نگاری کے رنگین دل آویز مرقعے مثنوی میں کثرت سے ملتے ہیں۔شادی بیاہ،محفل،جشن،لباس، سجاوٹ سواری ، میلے،اور آرائش قصرو باغ بھی خوب ہوتے ہیں۔منظر کشی یا مرقع نگاری اس وقت اپنے کمال پر نظر آئے گا جب شاعر کا بیان ماہر فن کے طور پر ہو،اور زبان ولفظوں کا چناؤ وانتخاب برمحل ہو۔قوت مشاہدہ اور خیال کی بھی توانا ہو۔مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں یہ شرط رکھی ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی بھی چیز اور کسی طرح بیان کیا جائے وہ لفظاً اور معناً نیچر ہو۔مگر ہمارے کچھ شعرا نے حقیقت اور تخیل کو ملا کر منظر نگاری کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

اگر دکنی شاعری کی طرف دیکھا جائے تو قدیم دور میں یہاں نظم گوئی کی تعداد نہیں ہے۔مثنوی گو شعرا کافی تعداد میں نظر آتے ہیں اِن تمام شعرا کی مثنویوں میں منظر نگاری کے نمونے بھی موجود ہیں،اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ اِن مثنوی میں منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں مگر زیادہ تر یہ منظر نگاری خالص اور ناقص ہوتی ہیں۔کلیم الدین کا خیال ہے۔

”یہی حال فطرت کا بھی ہے یہ نہیں کہ فطرت کے مرقع نہیں ملتے

ہیں ملتے ضرور ہیں لیکن دیکھئے ہوئی چیز کا ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ براہ راست کی
رنگینی دریاؤں کا سکون اور اس کی روائی ہندوستان کے سربے فلک کوہ اور
آبشار تاریک خوفناک گھاٹیاں اس قسم کی چیزوں کی تصویر بالکل نہیں ملتا
ہے۔ تو محض اس میں عموماً باغ کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ لیکن باغ میں ایسا
جیسے کہ فطرت نے نہیں لگایا رہے اور ہر جگہ تصنع ہے تمام بناوٹی غیر فطری
چیزیں دیکھائی دیتی ہیں۔

(اردو شاعری پر اک نظر، صفحہ ۳۴)

یہاں کلیم الدین احمد نے جو کہا ہے وہ صحیح ہے۔ بہت کم مثنوی نگاروں نے مناظر قدرت کے جلوے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اُن مثنوی کی منظر نگاری فرضی ہوتی ہے۔ ہر ملک میں مناظر قدرت ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر صبح، شام، رات، دن، آندھی، سمندر، اور طوفان وغیرہ زیادہ تر ہر ملک میں ایک ہی منظر پیش کرتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں۔

'' مثنوی کی دلکشی کو بڑھانے میں منظر کشی کو بھی بڑا داخل ہے منظر کشی کا
مطلب یہ ہے کہ شاعر مختلف نظاروں کا بیان اس طرح کرے کہ اس کی
ہو بہو تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جائے۔

(اردو کی چند یاب مثنویاں صفحہ ۱۹۲)

ولی گجراتی کی مثنوی میں منظر نگاری

ولی گجراتی نے بھی منظر نگاری کی طرف خاص توجہ کی ہے ۔اِن کی منظر نگاری کا نمونہ مثنوی ''درتعریف شہرصورت'' کے عنوان سے ہے۔اس مثنوی میں سمندر اور دریا کا نقشہ کھینچا ہے۔اس میں چنداشعار منظر نگاری کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔

جس سَن آب اس کی چمک جگ میں کانپا	سمندر موجزن رگ رگ میں کانپا
کنارے اس کے اک دریائے	کہ دنیا دیکھنے کو اس کے پٹّی
کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں غربا	ہوا دریا آپس کے عرق میں غرق
شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ	دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر	ہوا دیتی ہے اس میں یادِ کشمیر

(کلیات ولی،صفحہ ۳۵۴)

سراج اورنگ آبادی کی مثنوی میں منظر نگاری

سراج اورنگ آبادی نے بھی ایک مثنوی ''بوستان خیال'' میں مناظر قدرت کی تصویر کشی کی ہے۔اس مثنوی میں سراج نے باغ کا جونقشہ کھینچا ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت ہے ۔یہ اشعار منظر نگاری کے حوالے سے دیکھئے۔

روان آب کی طرف آبشار
جدھر دیکھے ہو رہی تھی بہار
(بوستان خیال،صفحہ ۴۳،۴۲)

یہ اشعار منظر نگاری کی بہترین مثال ہے۔مذکورہ اشعار میں آب رواں کی مکمل تصویر ہے۔پروفیسر

عبدالقادر سروری نے مثنوی ''بوستان خیال'' کی تعریف اِن لفظوں میں کیا ہے۔

''اس مثنوی میں لطفِ مناظر کے مصوّرانہ بیانات مرقعوں اور جذبات انسانی کی صحیح صورت گری میں ہے اگر روز مرہ کے اختلاف کو وجہ امتیاز بنایا جا سکتا ہے تو بوستان خیال درجہ سحر البیان بعد ہے ورنہ اس کے بعض پارے سحر البیان پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔''

(اردو مثنوی کا ارتقاء، صفحہ ۹۸)

اس مثنوی کے جذبات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق تو صرف منظر نگاری سے ہیں۔ دکن کے شعرا نے منظر نگاری کو اپنے مثنویوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے مناظر قدرت کے بیان کے سلسلے میں تصنع تکلف اور آدرد کو دخل نہیں دیا ہے بلکہ اپنے مشاہدے سے کام لیا ہے۔ مناظر قدرت کو دکنی شعرا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انھیں کو نظم کیا ہے۔ اِن میں دکنی سے لئے کرشمالی ہند تک نام لیا جا سکتا ہے۔ شعرا نے اپنی تخیل کی بنا پر دیگر مما لک کے مناظر قدرت کو نظم کیا ہے۔ اسلئے ان کی منظر نگاری قیاسی اور فرضی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا کی مثنوی میں منظر نگاری

مرزا محمد رفیع سودا بطور قصیدہ نگار اپنا نام ومقام رکھتے ہیں گویا انھوں نے قصیدہ کے علاوہ دیگر اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کی مگر قصیدہ ہی ان کی اصل پہچان ہے۔ سودا نے کل ۲۴ مثنویاں تخلیق کیں۔ سودا کی ایک مثنوی ''موسم گرما'' خالص منظر نگاری کی مثنوی ہے۔ مثنوی میں چند اشعار ملاحظہ ہو۔

گرم ہے یہ بہار کا موسم　　شاخ گل پھل جڑی سے کیا ہے کم

غنچے کھلتے ہیں یوں ہوآتش بار　　گویا پھٹتا ہے داغتے میں انار

نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت　　دی ہے آتش ستاروں کی یک لخت

کروصد برگ و جعفری پہ نظر　　چھٹ رہی ہیں ہوائیاں منھ پر

اس موقعے پر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''سودا موسم گرما کا بیان پوزور طریقہ سے کرتے ہیں۔''

(اردو شاعری پر اک نظر، صفحہ ۹۶)

میر تقی میر کی مثنویاں میں منظر نگاری

میر تقی میر نے ۳۷ مثنویاں تخلیق کیں کہ جس میں تین اہم مثنویاں 'دریا عشق'، شعلہ عشق، جذبہ عشق وغیرہ شامل ہے، میر تقی میر نے خارجی مناظر کو اپنی مثنویوں میں جگہ دی ہے۔اور جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کو بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔میر کی مثنویوں میں کلاسکی روایت ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے اپنے مثنویوں کو کلاسکی ادب سے جوڑ دیا ہے۔میر نے ایک مثنوی ''دریا عشق'' عنوان سے لکھی ہے۔جس میں میر نے بہار کا منظر پیش کیا ہے۔

آب کیسا کہ بحر تھا ذخار　　تُند و موج، تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفان پر　　مارے چشمک حباب عماں پر

ہم کنار بلا ہر اک گرداب　　لجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گزرِ موج جب نہ تب دیکھا   ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

(کلیات میر، صفحہ ۴۱، ۴۲)

مثنوی ''ساقی نامہ'' میں منظر نگاری دیکھئے۔

آئی ہے بہار مے گساراں   پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں

آئی ہے بہار مرغ گلزار   کرتا ہے نوائے سینہ افکار

گل بادِ صبا کے تا کمر ہے   دامانِ ہے بلند ابرِ تر ہے

غنچے کی گلابیاں بھری ہے   تکلیف کی منتظر دھری ہے

اطراف چمن کھلا ہے لالہ   ہر پھول شراب کا ہے پیالہ

(کلیات میر، صفحہ ۱۵۲، ۱۵۱)

اس نظم میں ایک جگہ پر منظر نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں َ

آتا ہے چمن پہ ابرِ جوشاں   آب رُخ کار سبز پوشاں

تحریکِ نسیم دم بہ دم ہے   تکلیف ہوائے گل ستم ہے

ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی   اُٹھتے ہیں یہ صدا سیاہ مستی

بوندوں کا جو لگ رہا جھمکا   رنگِ گل و لالہ زور چمکا

ہے گل کی ہوا سبوکشی میں   بلبل کا دماغ بُو کشی میں

ہر شاخ ہے شوق جام در دست   نرگس ہے کسو کی نرگسِ مست

ہے رنگ ہوا کا آفتابی   جھومیں ہیں نہال جوں شرابی

ہے سرور جوانِ نشہ در سر لوٹے ہے روش پہ سبزہ تر

(کلیات میر، صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱)

رات میں دریا عبور کی منظر نگاری:

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی پانی کے سطح پر نگاہ پڑی

لمبے لطمے کا کیا کہوں میں اُوج باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

آب تہہ دار اور تیز بہت لہر اُٹھتی جو تھی سو خیزہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

جزر ومد سب حواس کھوتا تھا خضرؑ کا رنگ سبز ہوتا تھا

(کلیات میر، صفحہ ۱۶۰)

میر نے واقعاتی مثنویاں میں منظر نگاری کو بخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں میر کی ایک مثنوی ''در بیانِ ہولی'' کے نام سے ہے۔میر نے اس مثنوی میں مختلف رنگوں کو پیش کیا ہے۔اور مثنوی کے لفظوں کو سجایا ہے۔

مثنوی کے چند اشعار میں منظر نگاری:

اس چمن میں باغ پر گل سرخ و زرد نکہتِ گل جھاڑیں گئے واں آ کے گرد

پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر لالہ و صد برگ سب باغِ نظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں جیسے گل دستہ تھے جوؤں پر رواں

(کلیات میر، صفحہ ۲۸۱)

میر تقی میر کے ان شہکار نامہ مثنویوں کے بارے میں ''جمیل جالبی'' اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں۔

> ''اِن شہکار ناموں کی اہمیت یہ ہے، کہ ان میں میر تقی میر ایک نئے رنگ نئے روپ میں سامنے آئے ہیں اور خارجی دنیا کے خوبصورت مناظر اور رنگین تصویریں ایسے پُر اثر انداز میں کھینچتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ صلاحتوں کا ایک نیا رُخ سامنے آتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، صفحہ ۶۳۲)

میر حسن کی مثنویوں میں منظر نگاری

میر حسن کی مثنویوں میں مناظر فطرت کا بیان ملتا ہے میر تقی میر کے بعد یہ دبستان دہلی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ میر حسن نے یوں تو غزلیں بھی تخلیق کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن میر حسن کی اصل شناخت ان کی شہکار مثنوی ''سحرالبیان'' کی بدولت ہوئی ہے۔ میر حسن نے ۱۲ مثنویاں تخلیق کیں لیکن ان مثنویوں میں چند کا ذکر کرے کہ جن میں میر حسن نے منظر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

تو کہے دریا میں تھا کوہِ طلا   یا کہ بادل تھا سنہری، شام کا
فیلوں پہ زریں نہ تھیں عماریاں   ابر میں تھے نور کے قبے رواں
نور کے دریا سے بھر بھر کر گھڑے   سر اُوپر لے لے فرشتے ہیں کھڑے
دیکھنا اِن مٹکوں کی آب و تاب   کوزے میں دریا ہوا تھا آب آب

کشتیاں یوں تھیں جواہر کی رواں جس طرح دریا میں تیریں کشتیاں
چشم گیتی نے نہ دیکھا زینہار موسم ہر گل کی ہوا اِک جا بہار

(مثنویات میر حسن، صفحہ ۵۵)

ایک جگہ پرنور کی منظر کشی دیکھئے۔

ایک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور موجزن ریتی پہ تھا دریائے نور
کاسہ مہتاب تھا اس کا حباب نور سے لبریز مثل آفتاب
پلٹنیں دونوں طرح مثلِ کنار زیب بخش موجِ دریا وار پار
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار نور کی سی لہر تھی فوارہ وار

(مثنویات میر حسن، صفحہ ۳۶۔۳۵)

میر حسن نے اپنی مثنوی ''سحرالبیان'' میں سواری، جشن، رقص وسرور، موسیقی، محفلوں کی تصویر کشی، رسم ورواج کی تصویر کشی، شادی وبیاہ کی تصویر کشی وغیرہ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اِن کا اصل موضوع خارجی مناظر کی مرقع کشی ہے۔''سحرالیبان'' لکھ کر میر حسن نے چار چاند لگائے ہیں۔اس مثنوی میں منظر نگاری ہر طرح دیکھائی دیتی ہیں۔ جیسے چاندرات کا سماں، باغ کی منظر کشی، جنگل کی منظر نگاری وغیرہ ہے۔

سحرالبیان کے منظر نگاری میں جابجا احساس کا نور بڑی شدت سے بیان ہوتا ہے۔شام کی منظر کشی کے بعد ذرا چاندنی رات کی سیر بھی کیجئے۔

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا وہ جاڑے کی آمد، وہ ٹھنڈی ہوا

وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقت نور

نظر آئی وہاں چاندنی کی بہار — کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار

در و بام یک لخت سارے سفید — ہر اک طاق، محرابِ صبح امید

مُغرّق زمین پہ تمامی کا فرش — جھلک جس کی، لے فرش سے تا بہ فرش

زمین کا طبع آسمان کا طبع — سُنہری، رُپہری ہوں جیسے ورق

بلوریں دھرے ہر طرف سنگِ فرش — کہ جس سے منور رہے رنگِ فرش

ہر اک سمت وہاں نور کا ازدحام — لگے آئنے قدِ آدم تمام

(سحرالبیان، صفحہ ۱۲۳)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

لپیٹے ہوئے بادلوں سے درخت — زمین و ہوا، صاحبِ تاج و تخت

مُلبّب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر — پڑے چشمہ ماہ سے جس میں لہر

لبِ نہر پر صاف جو غور کی — تو پڑی تھی وہ ایک بلور کی

پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے — ہوا پیچ موتی سے لُٹتے ہوئے

مقرض پڑا اس میں مقیش جو — گرا ماہ وہاں رشک سے پُرزے ہو

زمین نور کی، آسمان نور کا — جدھر دیکھو اُدھر سماں نور کا

چمن سارے وادیوں سے بھرے — جوانانِ شبّو کے ہر جا پرے

ستاروں کا مہتاب میں حال یوں — کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں

اگر کیجیے سایے اُوپر نگاہ | تو ہے وہ بھی جوں سایہ مہرو ماہ
کرے ہے نگاہ جس طرح کو گزر | بجز نور آتا نہیں کچھ نظر

(سحر البیان، صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳)

میر حسن نے ایک جگہ پر دشت کی رات کا منظر دکھایا ہے۔

وہ سُنسان جنگل، وہ نورِ قمر | وہ بَرّاق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میدان، چمکتی سی ریت | اُگا نور سے چاند تاروں کی کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے | خس و خار جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایے سے مہ کا ظُہور | گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
درختوں سے لگ لگ بادِ صبا | لگی وجد میں بولنے واہ واہ

(سحر البیان، صفحہ ۲۳۵، ۲۳۴)

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میر حسن نے مناظر قدرت کو اپنی مثنویوں میں جگہ دی۔اور سحر البیان لکھ کر یہ بات واضح ہوتی ہے۔کہ ان کی منظر نگاری تخیلی اور قیاسی ہے چند اشعار دیکھئے۔باغ کی منظر نگاری ملاحظہ کیجئے۔

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن | کہیں نرگس وگل کہیں یا سمین
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیاں | کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار | جدا اپنے موسم میں سب کی بہار
کھڑے سرد کی طرح چمپے کے جھاڑ | کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

گلوں کو لب ہنر پر جھومنا اس اپنے عالم میں منھ چومنا

وہ جھک جھک کر گرنا خیابان پر نشہ کا سا عالم گلستان پر

(مثنوی سحرالبیان، صفحہ ۲۸۔۲۹)

دیا شنکر نسیم کی مثنوی میں منظر نگاری

گلزارِ نسیم اور سحرالبیان اردو کے مختلف اسالیب کی نمائندہ ہیں۔ ان دونوں کے لیے بڑا فخر ہے کہ اس طرز پر کوئی اضافہ نہ کر سکا ہے۔ گلزارِ نسیم اور سحرالبیان دونوں نقش اول اور نقش آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ورنہ تو اردو میں بہت سی مثنویاں ہیں لیکن جو بات اِن دونوں میں ہے وہ دوسری مثنویوں میں نہیں ہے۔ اس بارے میں رشید حسن خاں رقمطراز ہیں:

> ''داستان کی خوبی اس کی ذیلی تفصیلات میں پنہاں ہوتی ہے ۔تفصیلات نہ ہوں تو رزم بزم کی مرقع نگاری نہیں ہو پائے گی اس میں مناظر کا مصورانہ بیان نہیں کیا جا سکے گا اور معاشرت کی قدِ آدم تصویریں نہیں بن پائیں گی نسیم نے یہ عجب انداز اپنایا ہے کہ نثری قصے میں جو تفصیلات تھیں انھیں اختصار کے شکنجے میں نسیم کے وقت تک نیا راگ راور اپنا رنگ جم چکا تھا۔ شاعری بندش الفاظ تھی اور بندشِ الفاظ نگینے جڑے سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی زندگی سر سے پیر تک رعایتوں اور تلازموں کا نگار خانہ تھی۔ نسیم نے یہی نیا رنگ پسند کیا۔''

(گلزارِنسیم،صفحہ۱۴۰۔۱۴۱)

مثنوی گلزارِنسیم کے بارے میں ابواللیث صدیقی نے بھی اپنی رائے دی ہے۔

''نسیم نے باغ جنگل اور بارہ دری کے مناظر کو اکثر بیان کیے ہیں لیکن اس قدر اختصار سے کام لیا ہے، کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں آتا ہے۔''

(لکھنو کا دبستان شاعری،صفحہ۱۹۰)

اس مثنوی میں کہیں باغ کا منظر، کہیں رات کا منظر، کبھی صبح کی منظر کشی اور کبھی پھول گُم ہو جانے کا منظر پیش کیا ہے۔اس مثنوی میں دیا شنکر نسیم نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے مثنوی میں رونق بڑ گئی ہیں۔

باغ کا منظر :

اک باغ تھا نہر کے کنارے جویائے گل اُس طرح سد ھارے

اک نہر تھی شہر کے برابر ٹھٹکے سَیّارے رے کہکشاں پر

(گلزارِنسیم،صفحہ۱۵۵)

صحرا طلسم کا منظر بھی دیکھئے۔

بے مہریِ چرخ سے جو نگاہ گرداب کے ہالے کا ہوا ماہ

جو ماہِ سپہر بر تری تھا سو ماہی بحرِ اَبتری تھا

بادل سا وہ بحرِ آسماں جُوش بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش

دریا تھا نہ بحرِ تھا نہ جیحوں طوفانِ طلسم، جُوشِ اَفسوں

گرتے تو پانی سر سے گزرا اُبھرا، تو نہ کچھ نظر سے گزرا

موجوں کے عوض تھی، چینِ داماں گرداب کے بدلے، تھا گریباں

آگے جو بڑھا جزیرہ دیکھا اشجاروں کا ذخیرہ دیکھا

جس پھل کو چھوا، جو پھر غور کیا ہاتھ آیا نہ کچھ احباب کے طور پر

جانا کہ طلسم کا جنگل ہے یاں کے درخت کا یہی پھل

اور آگے بڑھا وہ سحرِ اوہام ڈوبا خورشید، ہوگئی شام

لہرا لہرا کے اوس چاٹی بن میں کالوں نے رات کاٹی

کچھ گائیں کیلیں کر رہی تھیں بن میں ہری دوب چر رہی تھیں

(گلزارِنسیم، صفحہ ۱۸۲)

جنگل کا منظر بھی دیکھئے۔

ایک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد صحرا عدم بھی تھا جہاں گرد

سایے کو پتا نہ تھا شجر کا عنقا تھا، نام جانور کا

مرغاں ہوا تھے ہوشِ راہی نقشِ کفِ پا تھے ریگ ماہی

وہ دشت کہ جس میں پُر تگ و دو یا ریگ رواں تھی یا وہ رہ رو

(گلزارِنسیم، صفحہ ۱۸۹)

مرثیہ میں منظر نگاری

مرثیہ وہ صنف نظم ہے کہ جس میں مرنے والے کی تعریف کی جاتی ہے۔اصطلاح میں مرثیہ اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کا بیان ہو۔ردو مرثیہ کا موضوع بھی انسان سے رہا ہے جہاں اس میں کربلا کے شہید کا ذکر کیا گیا ہے۔

اردو میں مرثیہ گوئی کا آغاز دکن کی سرزمین سے ہوا۔دکنی مرثیوں میں منظر نگاری کا باقاعدہ طور پر پتہ نہیں چلتا ہے اور جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے یہاں پر سب سے پہلے میر ضمیر نے مرثیوں کو وسعت دی ہے۔میر ضمیر نے اپنے مرثیوں میں تمہید کے ساتھ سراپا بھی پیش کیا ہے۔پھر میدان جنگ کا نقشہ کھینچا اور آخر اجزاء میں شہادت کے واقعات بیان کیے ہیں۔

اردو میں قلی قطب شاہ نے مرثیہ کہا ہےِان کے مراثی میں واقعی نگاری اور منظر نگاری ملتی ہے۔ایک طرف محمد قلی قطب شاہ اور دوسری طرف عادل شاہ ثانی نے مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اِن بادشہوں کے دور میں نوری،نصرتی،وجہی،غواصی،مرزا جیسے شعرا پیدا ہوئے ہیں مرزا پہلے اُردو مرثیہ نگار ہیں کہ جس نے واقعہ کربلا کا سلسلے وار بیاں مراثی میں نظم کیا ہے۔مرزا کے مرثیوں میں فطرت کا بیان ملتا ہے۔اِن کے بعد افضل،کاظم،رومی،اور بحری وغیرہ بھی مرثیہ کے اہم شعرا ہیں۔ان کے مرثیوں میں بھی فطرت کا بیان ملتا ہے۔اس دور کے بعد مغلیہ دور شروع ہوتا ہے اِن کے بھی یہاں مناظر قدرت کا بیان ملتا ہے۔دور مغلیہ میں ذوقی،بحری،اشرف اور ہاشم علی وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں۔ان کے دور میں مرثیہ نگاری کو فوقیت حاصل ہوئی ہے۔

جہاں تک دبستان دہلی کا تعلق ہے ان میں اصلاح،شاہ مبارک آبرو،مسکین،غمگین،ندیم،حزیں اور یک رنگ وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک دلی میں مرثیہ گو شعرا کی تعداد

کافی بڑ گئی ہیں اس دور میں مرثیہ نگاری کو ترقی کی منزل حاصل ہوئی ہے۔

آخر پر لکھنو کی بات کرتے ہیں لکھنو شاعری کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔لکھنو والوں نے مرثیہ نگاری میں چار چاند لگائے ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال انیس و دبیر ہیں۔اس عہد میں مرثیہ کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی ہے جس کا اثر دور جدید تک رہا ہے۔بہر حال اردو مرثیہ کی ابتداء دکن سے ہوئی تھی۔مرثیہ کے آغاز میں صرف بین کے اشعار ہوتے تھے بعد میں مرثیہ کا دائرہ وسیع ہو گیا اس میں ہر طرح کے مضامین داخل ہونے لگے۔جس میں چہرہ،ممدوح کے مناقب،دشمنوں کے معائب،مناظر قدرت، منظر نگاری،،جنگ کا بیان،رجز میں خاندان کی تعریف،جنگ کا بیان،گھوڑے کی تعریف،سامانِ حرب وضرب وغیرہ ہے مرثیہ اردو نظم کی مستقل صنف بن گی۔ہمارا موضوع منظر نگاری ہے اسی منظر نگاری کے بیان میں عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

> ''داستان بیان کرنے کے ضمن میں مرثیہ نگار کو بھی فطرت کے خارجی مناظر سے بھی اکثر سابقہ یہ پڑتا ہے۔کبھی مناظر فطری کسی واقعے کا چوکھٹا بن جاتے ہیں اور ہم ان کرداروں کو مختلف موسموں میں اور زمانوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔اور کبھی فطرت کے مناظر یوں ہی مرثیہ نگار کا دامن کھینچتے ہیں۔مہکی ہوئی ہوائیں اس کی طبیعت کو گدگداتی ہیں،بولتے ہوئے طیور اس سے نغمہ سرائی پر اُکساتے ہیں،موجِ رنگ اس کے دل میں مربوط رنگوں کے کئی سلسلے پیدا کرتی ہے ایسی صورتوں میں مرثیہ نگار کی روح گویا فطرت میں رس بس ہو جاتی ہے یا فطرت اس کی روح

میں رچ بس جاتی ہے اور وہ ایسے شعر کہتا ہے اور جنھیں سن کر ہم اپنے پانچوں
حواس سے کام لیتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سنتے ہیں اور پھولوں کے رنگ
دیکھتے ہیں۔خوشبو کی موج ہمارے مقام جان تک پہنچتی ہے،سبزے کو مخملی
فرش کو ہم مس کرتے ہیں اور کبھی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پھولوں کے
ساتھ کہیں پھل بھی لگتے ہیں اور ہم انہیں چکھتے ہیں مختصر یہ مرثیہ نگار ہمارے
خیال کو تمام مرحلوں سے گزر کر فطرت کی تمام رعنائیاں دکھاتا ہے۔''

(اصول انتقادِ ادبیات،صفحہ ۵۵۶،۵۵۷)

ایک جگہ پر سیادت نقوی لکھتے ہیں:

''میر ضمیر اور میر خلیق کا عہد اُردو کی تاریخ میں ایک ایسے درخشندہ دور کا
نقیب سمجھا جاتا ہے جس میں مرثیے نے اپنی معراج ارتقا حاصل کی
ہے۔اسی زمانہ سے اردو مرثیہ کی اس ارتقائی رفتار کا آغاز ہوا ہے۔جس
نے انیس و دبیر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اردو شاعری کی اس اہم صنف کو
ایسی آفاقیت عطا کی ہے جو تاریخ ادب میں قابل فخر رہے گی۔''

(مرتبہ اردو مرثیہ،صفحہ ۳۱۰)

میر کی مراثی میں باغ کی منظر نگاری بکثرت ہے مگر یہ منظر نگاری اس طرح کی نہیں ہے بلکہ اس
منظر نگاری میں صبح کا عالم،دشت،نور کا عالم وغیرہ لفظوں کا انتخاب کیا ہے۔

صبح کی منظر نگاری

نکلا جو سرِ مہر گریباں سحر سے انجم کے گہر گر گئے دامانِ سحر سے
مہتاب کا رنگ اُڑ گیا دامانِ سحر سے روشن ہوا صحرا رُخ تاباں سحر سے
جو وادی ایمن میں ہوا طور کا عالم
وہ خیمہ شبیرؑ میں تھا نور کا عالم
وہ نور کا تڑکا اُدھر اور صبح کا عالم گھٹنا مہ وا نجم کی تجلی کا وہ کم کم
آتی تھی صدائے دہل صبح بھی پیہم چلتی تھی نسیم سحری دشت میں تھم تھم
کرتا تھا چراغ سحری عزم سفر کا
اور شورِ درختوں پہ وہ مرغانِ سحر کا

(لکھنو کا دبستان شاعری، صفحہ ۳۳۴)

صبح عاشورہ کی منظر نگاری

جب چرخ کا وہ طائر زرّیں نظر آیا زاغِ سیہ شب نے نشیمن کو اُٹھا یا
مرغابیِ انجم نے جو اک پرتوہ پایا غوطہ وہیں، اس قلزم اخضر میں لگایا
پر آ جو گئے طائر بیضا کے چمک پر
گم ہونے لگا بیضہِ مہتاب پر

(لکھنو کا دبستان شاعری، صفحہ ۸۴)

صبح عاشورہ کی منظر کشی کو بھر پور عکاسی سے بیان کیا ہے۔صبحِ عاشورہ کا یہ منظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

میر ضمیر نے اپنی مرثیوں میں کربلا کی منظر نگاری بھر پور انداز سے کی ہے۔آیئے اب گرمی کے مناظر کا بیان بھی دیکھئے۔

میدان کربلا کی منظر نگاری

میدان میں دو پہر جو دمِ جنگ ڈھل گئی　　بادِ خزاں ریاضِ محمدؐ پہ چل گئی

جُوں بوئے گل بہار چمن سے نکل گئی　　پانی بغیر شاخِ تر و خشک جل گئی

لاشوں کا رن میں کھیت پڑا تھا یہ کھیت پر

گل فاطمہؑ کے لوٹتے پھرتے تھے ریت پر

لُو چل رہی ہے چار طرف دھوپ ہے کمال　　اور زخم لہلہاتے ہیں سب پھول کی مثال

پیاسے ہوئے ہیں قتل جو زہراؑ کے نونہال　　دی ہے زبان، دہاں سے جو برگ گُل نکال

سیراب جن کی بارش رحمت سے خلق ہے

سو آج آبِ تیغ ہے اور اُن کا حلق ہے

یاں سے گئی ہے خاک اُڑاتی ہوئی صبا　　سُوئے ریاض باغ جناں واہ مُصیبتا

ماتم سرا گُلشنِ فردوس ہے ہَوا　　غل ہے کہ باغ حیدرِ کرار لُٹ گیا

طوبےٰ تلے بلند ہے فغانِ فاطمہؑ

جُوں گُل ہوا ہے چاک گریبانِ فاطمہؑ

نصف النہار کا جو عمل یک بیک ہوا لشکر وہ کٹ گیا شہِ انجم سپاہ کا
واں دو پہر ڈھلی کہ زوال اُن پر آ گیا غیر از حسینؑ اب کوئی باقی نہیں رہا
وقت زوال بھی ہے تمازت بھی خوب ہے
مہر سپہر دین کو قصدِ غروب ہے

(لکھنو کا دبستان شاعری، صفحہ ۷۸)

میر ضمیر کے دور میں ایک اور مرثیہ نگار دلگیر کے نام سے ہے۔ دلگیر میر ضمیر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ میر ضمیر کی طرح دلگیر اردو مرثیے کی تاریخ میں مکمل باب کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مراثی چھ جلدوں میں ہیں۔ کچھ مراثی میں منظر نگاری کے تصورات واضح و روشن ہیں۔

سحر کی منظر نگاری

پنجۂ غم نے کیا چاک گریبانِ سحر پڑ گیا رات کے رُخسار پہ دامانِ سحر
مثل خوں جائے شفق دیدہ گریانِ سحر سحر حشر کے مانند تھا عنوانِ سحر
ہوا مشغول عمر جنگ کی تیاری میں
شہؑ کو تشویش تھی تجویز علمداری میں

(اردو مرثیہ کا ارتقاء، صفحہ ۳۲۱)

مذکورہ اشعار میں پنجۂ غم نے سحر کا گریبان چاک کر دیا اور رات کے رخسار پر داماں سحر کو پھیلا دیا ہے۔ سحر خون کے آنسوں بہا رہا ہے اور میدان حشر کا ساماں سحر میں نمایاں ہے۔

شام غریباں کا منظر

بٹھایا شب کو اسیروں کو درخت تلے زمیں پہ بیٹیاں بیٹھی تھیں منہ پہ چاک ملے
سکینہ روتی تھی لگ لگ اپنی اماں کے گلے پرائی قید میں جو ہوں بس اُن کا خاک چلے
اندھیری شب میں کہاں چوکی دینے والا تھا
ستم زدوں کا نگہباں حق تعالیٰ تھا

(اردو مرثیہ کا ارتقاء، صفحہ ۲۳۱)

اردو مرثیہ کے تاثر کو بڑھانے کے لئے میر انیس سامنے آتے ہیں۔ انیس اردو شاعری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے کہ جس میں اِن کے سلام و رباعیات شامل ہیں۔ آپ اردو مرثیہ میں بڑے منظر نگار شاعر تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

''انیس کو مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ اس قسم کے بیانات غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت ہوئے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز میں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیا جاسکتے۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے۔ جس میں صدہا خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں۔ جو کہ بظاہر ایک دوسرے سے متعلق نہیں رکھتیں۔ مگر پھر بھی مجموعی حیثیت اسی کل کے تحت سب آجاتی ہیں۔ مثلاً صُبح کا سماں، طلوع آفتاب، نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے، شام کا سُہانا وقت، چاند کا

لطف تاریکی کا بھیانک نظر، باغ میں پھولوں کا کھلنا، مہکنا، سبزہ کی بہار،

الگ الگ چیزیں ہیں مگر یہ سب مرثیہ کے جزوضروری ہیں۔

(تاریخ ادب اردو، صفحہ ۳۷۴)

انیس سے قبل منظر نگاری محدود تھی ۔آپ نے اپنی منظر نگاری کو اردو میں تازگی عطا کی ہے۔ میر انیس نے جہاں بھی منظر نگاری کی ہے اس کا مقصد اصل واقعات کے اثر کو زیادہ نمایاں کرنا ہے۔مثلاً انیس ایک جگہ

صبح کی منظر نگاری

طے کر چکا جو منزلِ شب کارواں صبح　　ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح

گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہوگیا

عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں　　چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں

آئی بہار میں گل مہتاب پر خزاں　　مُرجھا کے گر گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور باد سحر نے سموم کے

پژ مُردہ ہوکے رہ گئے غنچے نجوم کے

چُھپنا وہ مہتاب کا وہ صبح کا ظہور　　یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طیور

وہ رونق اور وہ سرد ہوا، وہ فضا وہ نور　　　خنکی ہو جس سے چشم کو ہو قلب کو سرور

انسان زمین پہ محوِ ملک آسمان پر

جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر

(مراثی انیس،۱۰۹)

میر ببر علی انیس اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔انیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا جس میں انیس کے سلام ور باعیات بھی شامل ہے۔

انیس نے مرثیہ نگاری کو نئے وسعتوں سے مالا مال کیا ہے۔میر انیس نے ایک مرثیہ میں گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں بے شمار تصویریں کھینچی ہیں پانی کی روانی جاری تو ہے لیکن کنواں خشک ہے۔

آب رواں سے منھ نہ اُٹھاتے تھے جانور　　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

مَردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　　خس خانہ مژہ سے نکلی نہ تھی نظر

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں

پڑجائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار　　　ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار　　　کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخِ باردار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے

پتے بھی مثل چہرہ مدقوق زرد تھے

(مراثی انیس،۸۶)

مذکورہ اشعار میں نہ صرف گرمی کی شدت ملتی ہے بلکہ انیس نے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں ہر طرح کے مضامین پیش کئے ہیں۔مثلاً سحر کا بیان،گرمی کی شدت،صبح کی منظر کشی ،رات کا سما،دوپہر، پیاسی بچوں کی فریاد،گھوڑے اور تلوار غرض کہ ہر ایک موضوع اِن کی مرثیہ میں پایا جاتا ہے۔ انیس نے مرثیہ میں گرمی کی شدت کو نہایت ہی دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے اس بارے میں پروفیسر مسعود حسین خان فرماتے ہیں۔

'' انیس نے گرمی کی شدت کا بیان اس قدر طولائی اور اتنا مبالغہ کیا گیا ہے۔وہ جا بجا غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے مگر باکمال شاعر مبالغہ کے ساتھ اصلیت کی آمیزش اس ہوشیاری کے ساتھ کردی ہے اور دونوں کو اس طرح دوش بدوش لے چلا ہے کہ گرمی کی شدت کا حقیقی احساس قدم قدم پر ہوجا تا ہے۔ اس کے علاوہ حُسن بیان،ندرت تشبیہات جدت واستعارات حُسن تعلیل وغیرہ اتنی خوبیاں اس بیان میں بھر دی ہیں کہ سامعین پر حیرت سی طاری ہوجاتی ہے اور ان کو مبالغہ اور اصلیت امتیاز کرنے کا ہوش نہیں رہتا،مبالغہ کلام کی صنعتوں میں شمار کیا گیا ہو۔

(شاہکار انیس،صفحہ۱۸)

مرزا سلامت علی دبیر مرثیہ گوئی کے اُستاد کامل تھے دبیر نے تمام عمر اسی شغل میں بسر کر دی ہے۔ انیس خلیق کے شاگرد تھے اور دبیر ضمیر کے شاگرد تھے۔انیس کی طرح مرزا سلامت علی دبیر نے اپنے

مرثی گوئی میں فطرت کے عنواں سے پس منظر کو پیش کیا ہے۔حالانکہ دبیر مرثیہ گوئی کے استاد تھے۔ دبیر نے اپنے مرثیہ میں زور اور تاثر پیدا کرنے کے لیے مناظر فطرت کا سہارا لیا ہے۔مرزا دبیر کربلا کے تاثر کو بڑھانے کے لئے صبح عاشورہ کو غمگین بنا دیتے ہیں۔

صبح عاشورہ میں منظر نگاری

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی　　پنہاں درازی پرطاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زیف لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی　　مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکر رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لئے

نکلا اُفق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح　　محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیرِ صبح　　پھر سجدہ گاہ میں گیا مہرِ منیر صبح
کرتے تھے سب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفتِ عضو بنے تھے سجود کو

(مراثی دبیر، صفحہ ۲۵۲،۲۵۳)

مرزا دبیر نے اپنی منظر نگاری میں مشکل الفاظ استعمال کیا ہے۔دبیر نے مشاہدے کے بجائے تخیل سے زیادہ کام لیا ہیں۔فیسر محمد زمان آزردہ لکھتے ہیں۔

”کسی بھی منظر کے بیان کرنے میں وہ رنج والم کی کیفیت کو ساتھ لے

جاتے ہیں ایسے مقامات پر جہاں مناظر قدرت کھو جانے کی ضرورت ہے

وہاں اہل بیتؑ میں زیادہ گُم ہوجاتے ہیں وہ مناظر قدرت میں مصائب کو

نہیں دیکھتے بلکہ وہ مصائب اہل بیتؑ میں مناظر قدرت دیکھتے ہیں، پھر

بھی اکثر مقامات ان کی طرح نظم ہوتے ہیں جہاں پر یہاں ان کے

مظاہر قدرت کی تصویریں صاف واضح اور گہری ہیں۔

(مرزا سلامت علی دبیر، صفحہ ۲۶۶)

مرزا دبیر کے مراثی میں منظر کشی مکمل ہے۔ مرزا دبیر نے اپنی مراثی میں شب عاشورہ کے بیانات بیان کئے ہیں۔ جس میں مہتاب سجدہ لے کر حاضر ہونا، یہی نہیں بلکہ ستاروں نے آسماں کو تسبیح نذر کی، اور رات کے اندھیرے، بیابان کی سیاسی میں گرمی اور پانی کی شدت بہت خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔

تاریکی رات کا منظر

مغرب سے نمایاں ہوئی جس دم شب عاشور　　　　کچھ صبح قیامت سے نہ تھی کم شبِ عاشور

دل خلق کا کرنے لگی برہم شب عاشور　　　　زینبؑ کو ہوئی جامئہ ماتم شب عاشور

ظلمت کی ردا اس لیے ہر سمت پڑی تھی

سر کھولے ہوئے فاطمہؑ مقتل میں کھڑی تھی

جس وقت پڑا سکہ سیمِ قمر پر　　　　پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر

مریخ کا خنجر جو چلا ترکِ سر پر بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر
کیوں علم ایوانِ فلک اور چاند نگیں تھا
آفاق سلیمان کی طرح زیرِ نگیں تھا

شب تھی کسی بختی کفار ہر اِک سو چشمِ سیہ قہر تھی یا ظلم کا گیسو
کجر وصفت نقش نگیں تھے جو وہ بدخو آخوکو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو
روشن ہے سیاہ کار وہ سب فوج جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

مشتاق نماز ابنِ علی خیمے سے آیا مہتاب نے سجادہ مہتاب بچھایا
تسبیح ستاروں کی فلک نذر کو لایا مولاؑ نے بھی ایک ایک نمازی کو بلایا
فرمایا غنیمت جو کچھ طاعت رب ہو
لاشے پہ نماز اپنے خدا جانے کہ کب ہو

وہ شب کا اندھیرا وہ بیابان کی سیاہی گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی
آباد وہ گھر اور اک بار تباہی یہ حادثہ اورآل نبیؐ شانِ الٰہی
گر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے
پھر پیاس سے چونک اُٹھتے تھے سوتے ہوئے بچے

سن سن کے صدا آتی تھی میدانِ بلا سے غش ہوتے تھے اطفال درندوں کی صدا سے
اور خیموں میں بجھنا وہ چراغوں کا ہوا سے پوچھے کوئی اس حادثہ کو آلِ عبا سے

اِک ہاتھ سے ماں لیتی تھی اصغر کی بلائیں
اِک ہاتھ رکھے سینے پہ دیتی تھی دعائیں

(دبیر مرزا سلامت علی، صفحہ ۴۹)

پروفیسر کرار حسین فرماتے ہیں۔

''جس چیز کو منظر نگاری کہا جاتا ہے اس میں مرزا صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ بجائے ایک بڑی اور مکمل image پیش کرنے کی، جس میں اس کو یہ درجہ کمال قدرت حاصل ہے تشبیہ اور استعاروں کے ذریعے چھوٹی چھوٹی image تو اثر کے ساتھ پیش کرتے ہیں جن کا بہ ظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا اور جو علم اور تجربے اور مشاہدے کے دور دراز مقامات سے حاصل کی گئی ہیں، یا کبھی ایک استعارے کو منطقی کڑیوں کے ذریعے پھیلائے چلے جاتے ہیں۔''

(سوالات وخیالات، صفحہ ۱۱۱)

انیس اور دبیر کے زمانے میں ایک شاعر مرزا عشق تھے۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ نگار، اور انیس و دبیر کے ہم عصر بھی تھے۔ مرزا عشق نے ایک مرثیہ منظر نگاری کے عنواں سے لکھی ہے۔ آیئے مرزا عشق کے ہاں منظر نگاری کی مثالیں دیکھیے۔

آنکھیں ملیں جو دھوپ سے تارِ نظر جلے — جب آئے ہے مرغ تیر بگولوں میں پر جلے
دریا بنایا تنویر، صدف میں گہر جلے — آیا جدھر سموم کا جھونکا جدھر جلے

تھا رنگ لال آگ کے دریا سیراب تھے
شیخ بنی تھیں ڈالیاں غنچے کباب کے

(برہان غم، صفحہ ۱۱۴)

صبح کی منظر نگاری

آیا جو طور نور و ضیا پر کلیم صبح چلنے لگی ریاضِ علیؑ میں نسیم صبح
سلطان شرق نے کئے روشن حریم صبح مینائے آسماں کو ملا رنگ نسیم صبح
کس چیز کو غمِ شہ ثابت قدم نہ تھا
نالہ سے قہقہہ سحر غم کا کم نہ تھا
چمکا جو دشت جنگ میں تاجِ خروسِ صبح آغوش دیوِ شام سے نکلی عروس صبح
ویران تمام روم شبِ آباد طوس صبح تھا تخت آسمانِ کہن پر جلوسِ صبح
بھاگا خدیو شبِ رُخ سیّار مڑ گئے
لے کر چراغ بزم سے پروانے اُڑ گئے

(برہان غم، صفحہ ۱۰۱)

میر انیس کے بھائی میر محمد مونس نے بھی مرثیہ لکھئے ہیں۔انیس اور مونس دونوں بھائی خلیق کے فرزند تھے۔مونس نے اپنے مرثیوں میں منظر نگاری کو نہایت ہی دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔ اِن کے مرثیوں میں صبح کا بیان اور چاندنی رات کی منظر کشی بھی ملتی ہیں۔

آمد وہ آفتاب کی اور وہ سحر کا نور کافور ہوگیا تھا فلک پر قمر کا نور

پالا تھا نخلِ طور سے ہراک شجر کا نور پھیلا تھا چاند کی طرح دشت ودر کا نور

غنچوں کے منہ جو صبح نے شبنم سے دھوئے تھے

گویا گلوں نے عطر میں چہرے ڈبوئے تھے

(میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء، صفحہ ۲۷۶)

مذکورہ اشعار میں میر مونس نے لکھا ہے کہ آفتاب کی آمد سے ہی قمر کا نور کافور ہوگیا اور ہر نخل کا نور شجر تر سے بالا ہو گیا اور چاندنی کی طرح سب دشت و در منور ہو گئے۔ شبنم نے تمام غنچوں کے منہ، شبنم سے دھوئے۔

کربلا کی منظر نگاری

بستان کربلا کی وہ بُو باس وہ بہار مرغانِ خوش نوا کا چہکنا وہ بار بار

کوکو وہ قمریوں کی، وہ طاؤس کی پکار نالے وہ بلبلوں کے، وہ سبزہ وہ لالہ زار

کہتے تھے وجد کبکِ دری کو ہسار میں

بن میں غزال محو تھے، ضیغم کچھار میں

(میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء ۴۳۲)

گرمی کی شدت میں منظر نگاری

مثلِ چنار دھوپ سے جلتا ہے ہر شجر بیٹھے ہیں آشیانوں میں طائر کشادہ پر

ہراک جری ہے چہرے پہ روکے ہوئے سپر سنولا گئے ہیں فاطمہ زہراؑ کے سب قمر

جاتے ہیں غازی گھوڑوں کی باگیں لئے ہوئے

عباسؑ سر پہ شہؑ کے ہیں سایہ کئے ہوئے

(لکھنو کا دبستان شاعری، صفحہ ۳۷۶)

مرزا مونس کے بارے میں ابواللیث لکھتے ہیں:

''مونس کے ہاں سادگی صفائی ہے کبھی کبھی مشکل زمینیں بھی برتتے ہیں۔
محاورے اور زبان کی خوبی کو قائم و برقرار رکھا ہے سلاموں اور استعارات
بھی بڑی خوبی سے نظم کیے ہیں۔''

(لکھنو کا دبستان شاعری، صفحہ ۷۸

قصیدہ میں منظر نگاری

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔قصیدہ لفظ قصد سے نکلا ہے جس کے معنی ارادہ۔عام طور پر قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں کہ جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہو اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں۔قصیدہ کا موضوع مدح ذم، نصیحت و موعظمت، یا مختلف کیفیات و حالات وغیرہ کا بیان ہے۔

قصیدہ پہلے عربی زبان میں لکھا گیا ہے پھر فارسی سے اردو میں لکھا گیا ہے۔قصیدے کے پانچ ارکان ہیں۔تشبیب، گریز، مدح، مدعا، دعا ہیں۔قصیدے میں ہر قسم کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔اردو کے ابتدائی دور ہی سے قصائدہ کی تشبیب میں منظر نگاری ملنے لگی ہے۔

منظر نگاری کی تلاش میں جو شعرا نظر آتے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع رہا ہے۔محمد قلی قطب شاہ سے لئے کر سودا تک بہت شعرا سامنے آئے ہیں۔محمد قلی نے چنانچہ ہر صنف سخن میں نام کمایا ہے۔غزل ،مرثیہ،نظم،رباعی،اورقصیدہ وغیرہ میں پہچان بنائی ہے۔محمد قلی قطب شاہ فطرت پرست شاعر تھے اس نے اپنی تشبیب میں جو فطرت کے مناظر پیش کیے ہیں وہ اس کے مشاہدے پر مبنی ہیں۔اور اس کی تشبیب منظر نگاری صداقت اور اصلیت پر مبنی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا تعلق چونکہ اردو شاعری کے ابتدائی دور سے رہا ہے،اس لیے اس کے تشبیب بھی آدر اور تصنع نہیں ہے۔بلکہ اصلیت اور صداقت پر موجود ہے۔محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری میں زور بیان کا جادو ہے۔قلی قطب شاہ کی جادو بیانی دیکھئے۔

قصیدہ منقبت

آج شہِ چیں شرق نگر تھے شتاب

ڈھال فلک کی اُچا او شہِ عالی جناب

باندخنجر کرن کی، زریں فرنگ ہاتھ لے

صبح کے وقت آئیا پیک دو پیالی شراب

چڑکِ فلک فیلِ مست ،مستی سوں مکھ لال کر

گرم ہوا چلنے لگا دن، لے کٹک بے حجاب

(کلیات قلی قطب شاہ،صفحہ۲۱۰)

محمد قلی قطب نے بھی نعتیہ قصیدے لکھے ہیں آپ کے نعتیہ قصیدے میں بہاریہ تشبیب ہے اور باغ کی تعریف ہے۔محمد قلی قطب کے یہاں قدرتی مناظر کے بیان پر مشتمل قصیدے میں منظر کشی ہے۔

نصرتی نے بھی فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔اس کے مثنوی ''علی نامہ'' میں چھ قصائد موجود ہے۔''علی نامہ'' کا تعلق جنگ وجدل سے ہے جس میں بادشاہ علی عادل شاہ کی شجاعت کے کارنامے پیش کیے گئے ہیں اس مثنوی میں نصرتی نے درمیانی میں قصائد شامل کر دیئے ہیں جن میں مناظر قدرت کی تصویریں ہیں۔یہ منظر نگاری بھی ضمنی ہیں۔نصرتی نے منظر نگاری میں صداقت اور اصلیت کے جلوے دکھائے ہیں۔دکنی قصائد میں فارسی اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ کو بھی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔سر زمین دکن میں جگہ جگہ مناظر قدرت کا تذکرہ ہے ۔مقامی رنگ پرندے، پھول، پھل، موسم، باغ، گلستان، شجر، تہوار، طرز زندگی کی بہت زیادہ تفصیل ہے۔

ولی گجراتی کا تعلق دکن کی سرزمین رہا ہے۔گجراتی اکثر اپنی تشبیب میں فطرت کا استعمال کرتے تھے۔ولی ایک طرف دلی کے آب وہوا سے متاثر تھے دوسری طرف گجرات اور دکن کی درباروں سے متاثر تھے۔ان کے ہر اشعار میں منظر نگاری کی تصویریں ہیں۔

ہوا ہے خلق اُبر پھر کے فضل سُجائی | یک ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی
یہ آب صاف میں گوہر کو دیکھ خجلت سوں | صدف کی بیت میں گل کو ہوا ہی جیوں پانی
قطار قطرہ جنم سوں آج سبزہ خضر | لے سُجہ ہاتھ میں کرتا ہی اوعیہ خوانی
ہر ایک طرف جو ہوئی ریزش باراں | کیا آج تفرج نے جوش طوفانی

ہر ایک قطرہ شبنم ہے غیرت گوہر

ہر ایک پات برسا جواہر بیانی

(کلیات ولی،صفحہ ۳۴۹)

شمالی ہند میں دور قدیم کے شعرانے فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ان کے قصیدوں میں منظر نگاری کے اصل خط وخال نظر آتے ہیں۔ان میں سب سے بڑا قصیدہ نگار سودا ہے۔جس نے حضرت علیؑ کی شان میں ایک لا جوب قصیدہ لکھا ہے۔اس میں منظر نگاری کی تصویریں ہو بہو نظر آئی ہے۔

درمنقبت حضرت علیؑ کی شان میں منظر نگاری

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدہ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم عزوجل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض ڈال سے پات تلک،پھول سے لے کرتا پھل

واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ آبِ جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں

شاخ میں گاوِ زمین کے بھی جو پھوٹے کونپل

(کلیات سودا،صفحہ ۲۳۱)

سودا کے مذہبی قصائدہ میں بہار کا منظر زوردار اور عقیدت سے بیان ہوتا ہے۔وہ مناظر فطرت کو مبالغہ سے بھی بیا کرتے ہیں۔اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سودا نے اپنے قصیدہ نگاری کو منظر نگاری سے قریب لایا ہے۔سودا کے بارے میں شارب رودولوی لکھتے ہیں۔

''ان کے مشہور لامیہ قصیدہ کی بہاریہ تشبیب میں تخیل ، بلندی پروازی
مصوری اور مبالغہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے''۔

(افکارِ سودا، صفحہ ۳۴)

سودا نے حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اور حضرت امام باقرؑ وغیرہ کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔

درمنقبت حضرت امام حسینؑ کی شان میں منظر نگاری

زبس ہوا نے طروات کو واں کیا ہے نثار — شرار سنگ میں ہیں رشکِ دانہ ہائے انار
صبا گزر کرے اس جا سے گو یمن کی طرف — نہ ہو سوائے زمرد ، عقیق واں زنہار
جو نخلِ خشک کی تصویر کھینچے واں نقاش — ہر ایک شاخ وہیں سبز ہو کے لاوے بار
عجب نہیں ہے کہ ہوں اس ہوا سے دانے سبز — اگر زمین پہ گرے ٹوٹ سبحہ زوار

غرض میں کیا کہوں یارو چمن میں قدرت کے
عجب ہے لطف کی اس قطعہ زمیں پہ بہار

(کلیات سودا، صفحہ ۶۵)

سودا نے مذہبی قصائد لکھئے ہیں کہ جس میں بہار کا منظر زور دار اور عقیدت سے لبریز ہوتا ہے۔اس بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

'' سودا نے اپنے تشبیہوں میں بھی فن کمال دکھایا ہے ۔ بہاریہ تشبیہوں

میں سودا نے مناظر قدرت کے تاثرات کو کمال مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے ۔اس قسم کی تشبیب کو پڑھ کر نیچر nature poet of کا شبہ ہوتا ہے۔لیکن سودا کے یہاں نیچر اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ منظر کا حصہ نہیں بنتی ، بلکہ ایک خیالی تصویر بن کر سامنے آئی ہے۔جن میں حسنِ مبالغہ شاخ ودلکش رنگ بھرتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو،صفحہ ۳۴۵)

درمنقبت حضرت موسیٰ کاظم رضاؑ کی شان میں منظر نگاری

کیفیت بہار ہے گلشن میں یاں تلک | بلبل سے لے کر مست ہے اب باغباں تلک

صحن چمن پہ پھرتے ہیں مستی سے لوٹتے | لے کر ہوا کی موج سے آبِ وراں تلک

نشو ونمائے سبزہ و ریحان و یاسمین

طعنہ زنِ نمودِ خطِ گل رُخان تلک

(کلیات سودا،صفحہ ٦٧)

درمنقبت حضرت امام محمد باقرؑ کی شان میں منظر نگاری

چمن میں سبزہ روئیدہ پر نہیں شبنم | ہوئی ہے خسروگل پر نثار لالہ قلم

اِدھر کو لعل کے ساغر میں اِغوانی ہے | بھری ہے لالہ حمرا نے ہو خوش و خرم

لہک رہا ہے اِدھر سے اُدھر کو نا فر مان

لے اپنے ہاتھ نزاکت سے طرۂ نیلم

(کلیات سودا،صفحہ۳۹۲)

سودا کی بہاریہ تصویریں زیادہ قیاسی اور تخیلی ہوتی ہے۔شیخ چاندی نے بھی سودا کے قصائد کی بہاریہ تشبیب کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں۔

''یہ تمام بہاریہ تشبیں ہیں جن میں موسم بہار کے فطری اثرات و کیفیات تو کم ہیں لیکن خیالی تصویریں بڑی ہُنر مندی سے کھینچی گئی ہیں اور اس میں تشبیہ اور استعارہ اور مبالغہ و اغراق کا رنگ بھر دیا ہے۔''

(سودا،صفحہ۱۹۰)

سودا نے بزرگ گانِ دین کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ہیں جن میں سے ایک ''در مدح بسنت خاں خواجہ سرا محمد شاہی'' دوسرا ''در مدحِ سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر'' ہیں۔در مدح بسنت خاں خواجہ سرا محمد شاہی قصیدہ میں منظر نگاری دیکھئے۔

جلوہ اُن میں ہو جو رگِ گُل کے عکس کا آوے نظر وہ جُوں رگِ یا قوت ہُو بہ ہُو

یوں جلوہ گر ہے سرو کا سایہ کہ جس طرح کوئی سیاہ مست پڑا ہو کنارِ جُو

موسم چہار فصل کا اتنا بھرا رکھے

کیفیت بہار سے نرگس کے غنچے کو

(کلیات سودا،۱۰۲)

در مدسیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کی قصیدہ میں منظر نگاری دیکھئے۔

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاج دار ۔۔۔ کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکر بہار
کہتے ہیں یوں زبانی پیکِ صبا یہ حکم ۔۔۔ پہنچا حضور سے طرفِ باغِ روزگار
مرکب جو شاخ سار کے ہیں اُن پہ اب شتاب ۔۔۔ پہنچیں سوار ہو کے جوانانِ برگ و بار
ہیں بخشی وزیر جو مریخ و مہتاب ۔۔۔ اُن کو یہ امر ہے کہ امیرانِ نام دار
منھ کھول دو خزائن اشرفی کے تم ۔۔۔ پکڑ و قلم کو ہاتھ رکھو پیادہ وسوار
چہرے لکھا کے سرخ، نگہداشت اب کرو ۔۔۔ تعداد پوچھتے ہو تو بے حد و بے شمار
پس اہل کار لالہ خود رو سے یہ کہیں ۔۔۔ رنگین شاب مشکِ پیلانِ کوہسار
د گلے ہزار رنگ کے پہناویں ابر کو ۔۔۔ موجِ ہوا تلک ہو زرہ پوش اب کی بار
تقسیم کردیں غرقہ غنچے میں چھلتیں ۔۔۔ دیں دوپٹے گر رسالہ گُل ہو امیدوار
کہہ دیں کی چار نہر سے گلشن کے صحن باغ ۔۔۔ چار آئنے سج کے رہے مستعدِ کار

(کلیات سودا، ۹۸)

سودا کی کی قصیدوں میں منظر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''یہ بہاریہ تشبیب شاعرانہ ہنر مندی، فنی چابک دستی اور بے پناہ تخیل کی
مدد سے خوبصورت تصویریں بنانے کے کمال کا اظہار کرتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۹۶)

سودا کے بعد اُردو قصیدہ نگاری میں ذوق کا نام آتا ہے۔ ذوق نے اپنے قصائد میں فطرت کا

استعمال بطور پس منظر پیش کیا ہے۔ذوق نے بھی سودا کی طرح اُردو اور فارسی قصیدہ نگاری کی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے۔ذوق نے زیادہ تر درباری قصیدے لکھے ہیں۔ بادشاہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کی مدح میں کہا ہے انھوں نے اپنے قصیدوں میں منظر نگاری سے کام لیا ہے۔

ہر ایک خار ہے گل، ہر گل ایک ساغرِ عیش   ہر ایک دشت چمن ، ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرہ شبنم گہر کی طرح خوش آب   ہر ایک گُہر، گُہر شب چراغ پر تنویر

نہالِ شمع سے ہر شب چُنے گلِ شبّو   بہارِ عیش میں گل چیں کی طرح سے گل گیر

ہنسے چراغ تو ایسے ہنسی میں پھول جھڑیں   حیا سے رنگِ گلِ آفتاب ہو تغیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جوبن

کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطہ کشمیر

(قصائد ذوق،صفحہ ۶۷)

ذوق نے اپنے قصائد میں منظر نگاری کی شان کو برقرار رکھنے کئے لئے شوکت الفاظ استعمال کئے ہیں انھوں نے ایک قصیدہ میں منظر نگاری کی تصویریں دیکھائی ہیں جس میں لالہ گل،سحر رنگ شفق،چمن،برگل وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ہے آج جو یوں خوش نما،نور سحر رنگ شفق   پرتو ہے کس خورشید کا ، نور سحر رنگ شفق

یہ جوش نسرین وسمن، لالہ وگل کا چمن   گلشن میں گویا چھا گیا،نور سحر رنگ شفق

دیکھے چمن میں برگ گل آلودہ شبنم جو کل

خجلت سے پانی ہوگیا نورِ سحر رنگِ شفق

(قصائد ذوق، صفحہ ۱۲)

ذوق نے ایک قصیدہ برسات کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ قصیدہ بھی منظر نگاری کے اعتبار سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔

ساون میں دیا مہِ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارے — ساقی کو کہ پھر بادہ سے کشتی طلائی
کوندے ہے جو بجلی تو سوجھے ہے نشے میں — ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اُڑائی
کرتی ہی صبا آکے، کبھی فشانی — کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

(قصائد ذوق، صفحہ ۷۰)

ذوق کے قصیدوں کے بارے میں سلام سندیلوی فرماتے ہیں۔

''ان اشعار میں کچھ الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں۔ جو منظر نگاری میں مدد کر رہے ہیں۔ مثلاً ہلال، کے ساتھ ابروئے خم، کی ترکیب منظر نگاری میں اضافہ کر رہی ہے۔ بجلی کا کوندنا صبا کا مشک فشانی کرنا نسیم کا لخلخہ سائی کرنا، نرگس شہلا کی آنکھوں میں کاجل، برگ گل سوسن کا لب پر دھڑی جمنا، یہ الفاظ ایسے ہیں۔ جن کی مدد سے فطرت کی تصویر مکمل ہوتی ہے اس لحاظ سے ذوق نے اس قصیدہ میں مناظر فطرت کی عکاسی بہتر طریقے سے کی ہے۔''

(اردو شاعری میں منظر نگاری، صفحہ ۱۹۴)

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے چار قصیدے لکھے ہیں جن میں دو حضرت علیؑ کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح لکھے ہیں۔ درمنقبت حضرت علیؑ کی شان میں منظر نگاری دیکھیے۔

ساز یک ذرّہ نہیں فیض چمن سے بے کار   سایہ لالہ بے داغ سُویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہے بغرضِ سبزہ   ریزۂ شیشہ مے جوہر تیغ کہسار

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغِ پلنگ   تازہ ہے ریشہ نارنج صفتِ روئے شرار

مستی ابر سے گل چین طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا افکار

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوقِ بلبل

راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار

(دیوان غالب، صفحہ ۱۳۲)

ابھی ہم نے قلی قطب شاہ تا مرزا غالب مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے قصیدہ گو شعرا کے قصائد میں منظر نگاری میں باغ و بہار اور برسات وغیرہ مثالیں پیش کیں جو سب اپنی جگہ اپنی مثال آپ ہیں مگر بہار کے بیان میں جو دلکشی ہے وہ لاجواب ہے۔ بہت سے قصیدہ گو حضرات کے ہاں منظر بالکل مکمل ہے جو ہمارے موضوع کے مطابق ہے۔

دوسرا باب :

اردو شاعری میں منظر نگاری

(۱) ابتدائی دور

(۲) عبوری دور

اردو شاعری میں منظر نگاری

منظر نگاری کے حوالے سے اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جائیں گی ۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اردو نے قلی قطب شاہ، ملا وجہی غواصی، نصرتی سودا، ذوق، میر و غالب ، اور اقبال وغیرہ کو پیدا کیا ۔ اِن شاعروں کا ایک مخصوص مزاج تھا اور اپنی بے مثال شاعری میں منظر نگاری کے نئے نئے رنگ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مرزا غالب جیسے شاعر کی شاعری نے اردو کو عالمی ادب میں جگہ دی اور صنف غزل کو بام عروج تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل'' اردو شاعری کی آبرو قرار پائی۔ قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں جس میں منظر نگاری ہے ۔ جہاں تک غالب کی شاعری کا تعلق ہے ۔ غالب نے دریا، پانی۔ بحر، افق، آسمان ابر فلک اور کوہسار الفاظ استعمال کئے ہیں۔

اردو شاعری کی باقاعدہ ابتداء دکن سے ہوتی ہے دکنی شاعری میں مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ میں منظر نگاری ملتی ہے یہاں پر منظر نگاری کے زیادہ نمونے مثنوی میں ملتے ہیں اسکے علاہ دکنی قصیدوں میں بھی منظر نگاری موجود ہے اور یہ منظر نگاری بڑی حد تک واضح ہے جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے شمالی ہند میں زیادہ تر منظر نگاری ایرانی رنگ و بو کے زیر اثر ہے۔ دکن کی طرح شمالی ہند میں جو منظر نگاری ہے وہ بھی تخیلی ہے۔ اُن کی منظر نگاری میں عمومیت پائی جاتی ہے مقامیت کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس بارے

میں سلام سندیلوی کی رائے ہیں۔

''مناظر قدرت نے کوئی مستقل حیثیت پیدا نہیں کی ہے۔ بلکہ قصائد، مثنویوں اور مرثیوں میں واقعات کے سلسلہ میں بہار، خزاں کوہ، دریا اور صبح وشام کا ذکر آجاتا ہے وہاں اِن کے مناظر بھی دکھائے جاتے تھے۔''

(کتاب، شعرالہند، صفحہ ۴۵۴)

ابتدائی دور

اردو شاعری میں دور قدیم اور دور آخر پر طائرانہ نظر ڈالیں تو اس شاعری کا بیشتر حصہ منظر نگاری کی اصل خصوصیات سے عاری نظر آئے گا۔ یہ ساری منظر نگاری ضمنی ہے اردو کے جتنے بھی شعرا ہیں۔ انھوں نے منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے۔ بہت سے نقادوں اور تحقیق نگاروں نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب دریافت کیے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں شیخ محمد اکرام نے اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک سبب بتایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

'' یہ صحیح ہے کہ اگر انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں قدرتی مناظر کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ انگریزی ادب میں ان کے مناظر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انگلستان میں بالخصوص کثرت سے جھیلیں ہیں۔ شاندار مناظر قدرت کی جو فروانی ہے۔ دہلی شاعر اس خیال سے مرغوب ہوکر کہ انگریزی شاعری میں مناظر فطرت کے تعلق بہت نظمیں ہیں خود بھی اونچے پہاڑوں اور خوشنما جھیلوں کے خوبصورت مناظر کو شاعری کا موضوع بناتے

تو ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ اَن نیچرل، یا مصنوعی شاعری کوئی نہ ہوگی
۔کیونکہ شاعر نے خود یہ مناظر دیکھئے ہی نہیں ہے جولوگ گرم ملکوں اور
چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں انھیں دل فریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں
ملتا ہے ۔جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر سوئزلینڈ ہیں ان میں جو
خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوئے ہے وہ نسبتاً محدود ہے۔مثلاً صبح
وشام،شفق کی رنگیں، دریا کا کنارہ، بہار، برسات اردو شاعری میں منظر
نگاری کے کہیں بلند پایہ نظمیں ہیں۔''

(حکیم فرزانہ،صفحہ۱۵۶)

اردو شاعری کا آغاز سرزمین دکن سے ہوا ہے۔محمد قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس کے یہاں مختلف اصناف سخن ملتے ہیں۔اس نے قصیدے بھی لکھے ہیں ۔محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری غزل اور نظموں کے روپ میں بھی گل کھلائے ہیں۔اصلیت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کی پوری خدمت کی ہے۔وہ گولکنڈہ کے پانچویں بادشاہ تھے۔اس نے اپنے قصیدہ منقبت میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔جس میں طلوع آفتاب کی منظر کشی لا جواب ہے۔

آج شہ چین چلیا شرق نگر تھے شتاب
ڈھال فلک کی اُوچا شرعالی جناب
باند خنجر کرن کی زریں فرنگ ہات لے
صبح کے قیامت آیا پیک دو پیالی شراب

(کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ،صفحہ۲۰)

اس منظر کشی میں محمد قلی قطب شاہ نے جو تلمیحات کے الفاظ پیش کئے ہیں ۔اس کے خیالات بہت واضح ہیں ۔اور انداز و بیان بھی خوبصورت ہے۔محمد قلی قطب شاہ نے مذکورہ اشعار میں تخیل کے بجائے مشاہدہ سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کو اس منظر کشی میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری اہمیت رکھتی ہے ۔اس نے کہیں مناظر کی حیثیت سے خوبصورت تصویروں کے نقشے اُتارے ہیں۔آپ کو مناظر قدرت سے بہت لگاؤ تھا۔وہ شاعر کے علاوہ بادشاہ بھی تھے۔قلی کو اپنے پیاریوں کے ساتھ رنگ رنگیاں منانے کا موقع ملا ہے۔محمد قلی فطرت پرست شاعر ہے۔عورت سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی فطرت سے تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کا ذوق کتنا پختہ تھا ۔کہ اکثر اس نے خوبصورت بازاروں ،نفیس حماموں اور عالیشان محلوں کے ساتھ حیدرآباد کے شایان ’’شان باغ‘‘ بھی تعمیر کیے تھے۔محمد قلی قطب شاہ کی نظم ’’باغ محمد شاہی‘‘ سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ اُس زمانے میں باغوں کے اطراف چار دیواری ہوئی تھی۔ کہ اس پر تمام درخت اوران کے پھل و پھول نظر آتے تھے چار دیواری کے ساتھ ساتھ سڑک بنائی جاتی ہے جہاں سے باغ کے مناظر دکھائی دیتے تھے اور جس پر پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی ۔ پھولوں میں چمپا کلی کا خاص کر ذکر کیا ہے اور پھلوں میں انگور،انار،کھجور،ناریل جامن اور محمد پھل سے مراد غالبًا بادام ہے۔محمد قلی کے آم اور جام امردوں کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آم ہی کو محمد پھل کہا ہو۔محمد قلی قطب شاہ کی شاعری نے اردو میں ایک نیا مقام پیدا کیا ہے۔یہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری میں فطرت پرستی اور منظر نگاری کے تصورات موجود ہیں۔

دراصل محمد قلی قطب شاہ سے پہلے ایسا شاعر نہیں ملتا ہے جس نے باقاعدہ طور پر منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہو۔اس نے منظر نگاری سے کافی دلچسپی حاصل کی ہے جس کا ثبوت وہ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں

چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا

سہاتا تھا محمد پھل یمن ان کا نین یاد آیا

دس ناریل کے پھول یوں زمرد مرتباناں جوں ل

ہور اس کے تاج کو کہتا ہی پیالہ کر دکھن سارا

(کلیات سلطان محمد قلی قطب، صفحہ ۶۵، ۶۶)

مذکورہ اشعار میں ایک مصورانہ انداز سے باغ محمد شاہی کا نقشہ کھینچا ہے۔آپ نے صاف اور واضح الفاظ میں انگور، انار اور کھجور وغیرہ کے پھل کا ذکر کیا ہے۔محمد قلی قطب شاہ نے اپنے محل میں بیٹھ کر تخیل کی پرواہ نہیں کی ہے اس لیے یہ منظر کشی دور عبوری کے شعرا سودا کی منظر کشی سے کہی جدا ہے جو اکثر و بیشتر حالات میں قیاسی اور فرضی ہوتی ہے۔قلی قطب نے ان اشعار میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے

محمد قلی قطب شاہ کو ہندوستان کے موسموں سے بھی کافی دلچسپی تھی ۔اس نے ہندوستان کے موسموں پر بہت ہی حسین شاعری کی ہے کہ جس کا شمار اول شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے شاعری میں منظر نگاری ہے۔اس حوالے سے ایک اور جگہ پر ڈاکٹر محی الدین قادر زور لکھتے ہیں۔

''یہی وجہ ہے، کہ محمد قلی قطب شاہ نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی

ہے۔اور جس روز سے برسات کا موسم شروع ہوتا ہے وہ بڑی دھوم دھام
سے مجلس آرائی کرتا ہے۔شراب کے دور چلتے،مطربان خوش نوا رقص
وسرور کے کمال دکھاتے ہیں ۔باغوں میں جھولے ڈالے جانے عشق
وشگفتگی کے جذبات بھی ہونے لگتے مشک وزعفران وغیرہ مل کر اپنے جسم کو
سجالیا اور بیڑ بہوٹی کے رنگ کے سُرخ کپڑے زیب تن کرتیں پھول اور
پان کے طبق تقسیم کیے جاتے تمام محلات شاہی میں زمردی رنگ کی
مسندیں بچھادی جاتی ہے اور ہرطرح خوشی وخرمی کا اظہار کیا جاتا ہے۔''
(کلیات سلطان قلی قطب شاہ،صفحہ۲۴)

آپ نے برسات میں خالص منظر نگاری کے نمونے نہیں دکھائے ہیں بلکہ برسات کے ساتھ ساتھ ساتھ اپنی پیاریوں اور مہ جبینوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنا چاہیے محمد قلی قطب شاعر علاوہ ایک عاشق مزاج بادشاہ بھی تھے۔جس کو عشق اور ہوس پرستی کے سامان بھی میسر تھے۔ جب بھی وہ اپنی شاعری میں مناظر قدرت کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اپنے پیاریوں کو بھول نہیں سکتے ہیں۔اس طرح کہ ایک عام شاعر برسات کا بیان کرتا ہے تو اس کے یہاں حسین عورتوں کا اس قدر ذکر نہیں ہوتا ہے کہ جس طرح بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری کی یہ نمایاں خصوصیت ہے۔اِن کی منظر نگاری میں یہ بات بھی ہے کہ وہ ایک طرح بادشاہ تھے دوسری طرح اس کا تعلق جنگ وجدال سے بھی تھا اسی وجہ سے وہ اپنی منظر نگاری میں اپنی ہی فتح مندی کا ذکر کرتے ہیں ۔آپ نے نوروز بھی دھوم دھام سے منایا ہے وہ اس موسم کا بھی شیدائی ہے آپ نے نوروز پر کئی نظمیں کہے ہیں۔اس کے علاوہ ایک

قصیدہ ''عیدنوروز'' کے عنوان سے ہے۔اس قصیدہ میں منظر نگاری ہے۔اس کی ایک نظم ''نوروز'' کی کے چند بند یہاں پیش کی جاتی ہے۔

نورانی نوروز نوراں سو آیا　　　حمل حسب حالاں حضرت تھے دھایا

جگا جوت جگ میں وجھل کار جھم جھم　　　چمن جوگ چندر نمن جگ جگایا

ہوا ہے ہوا ہر طرف جنس کا

ہوس سوں ہری بن ہزاراں ہلایا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ،صفحہ)

اس میں محمد قلی قطب شاہ نے نوروز کے موسم کی آمد سے صیح مصوری کی ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اس موسم کی آمد سے بہت خوش ہے۔اس کی منظر نگاری سے اس کے جذبہ لطف اندوز پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری میں مختلف خصوصیات موجود ہیں وہ قیاسی اور تخیلی نہیں ہے۔اس نے جن مناظر کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے وہ سب کے سب اس کے مشاہدات کے اندر ہیں۔اس لیے آپ کی منظر نگاری میں صداقت اور حقیقت کا مرقع نظر آتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کا نام آتا ہے اس نے بھی مناظر قدرت کی لاجواب تصویریں کھینچی ہیں لیکن اس کے یہاں بھی خالص منظر نگاری نہیں ملتی ہیں بلکہ عبداللہ قطب شاہ نے بھی منظر نگاری میں اپنے جذبات عشق کو شامل کیا ہے۔کیونکہ حسین موسم نے اس کے عشق کو اُکسایا ہے۔

اس لیے اس کی منظر نگاری محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری سے ملی جلی نظر آتی ہے۔لیکن خود بھی عبداللہ قطب شاہ کے رنگ وروپ میں عشق کا اثر اس قدر رواں دواں نظر نہیں آتا تھا۔دراصل عبداللہ قطب شاہ حسن فطرت سے اس قدر لطف اندوز نہیں ہوسکا ہے کہ جس طرح محمد قلی قطب شاہ ہوا ہے۔ پھر بھی ہم اس کی مصورانہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بسنت آیا پھلایا پھول لالا سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا

چمن میانے پھیلا ہی پھول رنگ رنگ لپٹ نازک ایسے تھے ایک آلا

گلابی ہور مادی ہور اُجلا ہریا ہور لال ہور پیارا ہور کالا

ہوا مد پینے کا آیا ہے پیارے

تو مد پینے کو من کرتا آلا آلا

(عبداللہ قطب شاہ،صفحہ ۳۲۳)

مذکورہ اشعار میں شاعر نے اپنی شاعری میں منظرنگاری کے عنوان سے بسنت کا حسین موسم پیش کیا ہے۔اور پھولوں کی تعریف کی ہے وہ پھول کھل اُٹھے ہے اور یہ موسم بہت حسین ہے۔ وہ مے نوشی کو دیکھ کر آمادہ ہوجاتا ہے اور اس کا جو مطلع ہے اس سے بھی ظاہر کرتا ہے۔ دراصل عبداللہ قطب شاہ کی منظرنگاری خالص نہیں ہے اس میں جذبہ عشق بھی شامل ہے۔عبداللہ قطب شاہ اچھا مصور بھی ہے۔وہ اپنی شاعری میں موسم کے رنگ برنگ پھولوں کا ذکر ایک اچھے مصور کی حیثیت سے کرتا ہے۔جس قدر وہ ذکر کرتے ہیں ہم واقعی مختلف پھولوں کے رنگ اپنے تصویر کی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔اس میں عبداللہ قطب شاہ نے دکنی الفاظ پیش کئے ہے۔ جس میں بسنت،ہور،مادی،ہریا،وغیرہ شامل

ہے۔اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری میں منظر نگاری کا جو سفر ہے وہ پہلے دکن سے شروع ہوا ہے اور جس کی شروعات ان ہی شعرا نے کی ہیں۔

دکنی شاعری کی ابتدائی دور میں نظم گوئی کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔اس کے برعکس مثنوی شعرا کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔اِن شعرا کی مثنویوں میں منظر نگاری کے اچھے نمونے موجود ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے بعض اوقات میں ان مثنویوں میں منظر نگار خام اور ناقص ہوتی ہے۔اس بارے میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''یہی حال مناظر فطرت کا بھی ہے یہ نہیں ہے کہ فطرت کے مرقع نہیں ملتے ہیں ملتے تو ضرور ہیں لیکن دیکھی ہوئی، چیزوں کا ذکر نہیں ملتا، برسات کی رنگینی، دریا کا سکون ،اوراس کی روانی ہندوستان کے سر بے فلک کوہ اور آبشار دریا وکنار اور خوفناک گھاٹیاں اس قسم کی چیزوں کی تصویر بالکل نہیں ملتی اگر کہیں ہے۔بھی تو محض رسم عموماً باغ کی تصویر کشی ہوتی ہے۔لیکن باغ بھی ایسا جیسے فطرت نے نہیں لگایا ہے ہر جگہ تصنع ہے تمام بناوٹی غیر فطری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔''

(اردو شاعری میں اک نظر،صفحہ۳۱)

دکنی مثنویوں میں ملا وجہی کی''قطب مشتری''ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔آپ نے اس مثنوی میں منظر نگاری کی تصویریں کھینچی ہیں۔اور ہر جگہ پر کامیابی حاصل کی ہے۔ملا وجہی نے اپنی مثنویوں میں دکنی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔اس مثنوی میں ملا وجہی نے محمد قلی قطب شاہ کا کردار پیش

کیا ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ بنگال کی ایک شہزادی مشتری پر عاشق ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنے دل کی داستان اپنے وزیر عطارد کو سناتا ہے مثنوی میں منظر نگاری بھی ہے۔اس مثنوی میں ایک مقام پر وجہی نے ایک اژدر کی تصویر اُتاری ہے جب بادشاہ محمد قلی قطب شاہ اپنے دوست عطارد کے ساتھ محبوب کی تلاش میں راہ گرداں تھا تو بادشاہ نے جنگل میں ایک اژدہا دیکھا کہ جس کی شکل وشباہت اس قسم کی تھی۔

جو شیہ دیکھتے تھے نین لائے کر — یکا یک یک بھیس ہوں آئے کر

بلند ایک بنڈا پڑا واں نظر — دو مشغل چمکتے تھے اُس پر

دو رنگ تھے اس سے سیدھور سفید — کدھیں ہوئے پرگٹ کدھیں ہوئے نہ پید

جو بنڈا تھا سو یکا یک وہاں

لگا دسنے جگریاں سوں مل کر دھواں

(قطب مشتری، صفحہ ۵۰، ۵۱)

''قطب مشتری'' میں وجہی نے جو لفظ استعمال کئے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس مثنوی میں منظر نگاری اپنے جو بن پر ہے جیسے نینِ بھیس، بنڈا، مشغل، کدھیں، دھواں وغیرہ شامل ہے۔ قدیم شاعری میں مناظر قدرت کے رنگین اور دل آویز مرقع مثنوی میں کثرت سے ملتے ہیں۔ کبھی باغ کی رنگینی کا تذکرہ ہے تو کبھی گل وبلبل کی تعریفیں ملتی ہیں۔ یہ منظر کشی یا مرقع کشی بھی اس وقت اپنے کمال تک پہنچتے ہیں جب شاعر کا بیان فن کے طور پر ہو جس میں اپنی زبان، لفظوں کا چناؤ انتخاب برمحل ہو تب ہی شاعری میں تاثر بڑھ جاتا ہے اور شاعر کا کلام اثر انداز ہو جاتا ہے۔ ملا وجہی نے اپنی شاعری

میں ایک جگہ پر باغ کی منظر کشی کی ہے۔

نبفشہ مشک پائی تھی بال میں
سرور رقص کرتے تھے آ حال میں
سو رنگ سانولے خواب باتان بھرے
ندیم ہو کے بلبل جو چالے کرے
سو طاؤس پنکھی طوطی کبک و ہنس
پکڑ پیٹ لڑنے لگے ہنس ہنس

(قطب مشتری،صفحہ۵۹،۶۰)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذکورہ اشعار میں ملا وجہی نے باغ کا نقشہ نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے مذکورہ اشعار میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ باغ میں پھول پتوں کے پردے پھاڑ کر جھانکتے تھے اور نبفشہ مشک کی طرح مہک رہا تھا۔سرور رقص کر رہے تھے۔ وجہی کہتے ہیں کہ باغ میں بلبل ،طاؤس طوطی کبک اور ہنس وغیرہ موجود تھے۔مذکورہ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے حسین انداز سے مصوری کی ہے۔

اردو شاعری کے ابتداء دور میں دکنی منظر نگاری زیادہ کامیاب ہے۔کیونکہ اس منظر نگاری میں تصنع اور آورد کی جھلک نہیں ہے۔دکنی شعرا نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر منظر نگاری کی ہے یہ جو مصوری ہے یہ بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی مصوری سے بالکل جدا ہے۔ ملا وجہی نے ایک اچھے مصور کی حیثیت سے باغ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملا وجہی نے اس میں اپنے جذبات پیش نہیں کئے ہیں بلکہ وجہی نے جن

مناظر کا ذکر کیا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اِن سب مناظر کا تعلق سرزمین ہندوستان سے ہے ۔یہ وثوق ہے کہ ملا وجہی کی منظر نگاری صداقت اور اصلیت پر مبنی ہے۔

ملا وجہی کے دور سے تعلق رکھنے والے غواصی ہے یوں تو غواصی نے شاعری بھی کی ہے مرثیہ بھی لکھے ہیں۔لیکن اِن کا شمار بھی مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں ان کی شخصیت بھی یہی ہے غواصی نے اپنی مثنویوں میں مناظر فطرت کو جگہ دی ہے وہ اکثر اپنی شاعری میں منظر نگاری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔اس کی مثال اِن کی شاعری سے پتہ چلتا ہے۔انھوں نے ایک مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں غواصی نے سمندر کا نقشہ پیش کیا ہے۔اور ایک جگہ پر باغ ارِم اور باغ گلستان کا ذکر بھی کیا ہے۔

تلیں صاف پانی اوپر آسماں
برستا ہوا معتدل و درمیاں
صف بخش چوندھیر ہوجا
تماشے کیتک لیس نے بے نظیر
سود یک ذوق پانے تین دھات دھات
چلانے لگے جہاز دن اور رات

(سیف الملوک وبدیع الجمال،صفحہ۱۵)

مذکورہ اشعار سے پتا لگا تا ہے کہ غواصی نے بذات خود مصر کے سمندر کا منظر نہیں دیکھا ہے لیکن آپ نے ہندوستان کے سمندر غالباً دیکھے ہوں گے اس بیان سے اس نے مصر کے سمندر کی عکاسی کی

ہے۔کہ جہاں پر جہاز رات اور دن چلنے لگا تا ہے۔

غواصی نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے کمالات دکھائے ہیں۔اس نے ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' مثنوی لکھی ہے اس مثنوی میں کچھ ایسے کردار ہے جو خوب جھلکتے ہیں۔شہر بانو کی ماں بدیع الجمال ہے ایک جگہ پر وہ باغ چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔اس دوران غواصی نے باغ کا منظر پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چند پھولوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

کہیں رائی چمپا کہیں — کہیں موگرہ ہور کہیں ربتونی
کہیں یاسمین ہور کہیں مدن بان کہیں — کہیں تاج سرخ ہور ریحان کہیں
کہیں لالی ہور کہیں کہیں رنگینے گلال — کہیں پھول صدر برگ کے بے مثال
کہیں اس نے پھول کیتے کلیاں — دیکھیں تو نین کول اٹھیں گو گلیاں
کہیں تختے انگور کے بے بدل — کہیں انجیر و انار شیریں پھول

کہیں اخروٹ، بادام، کہیں سیب نفیس
کہیں جوز ،چلغوز، کہیں نفیس

(سیف الملوک و بدیع الجمال،صفحہ ۱۴۷)

آپ نے اپنی شاعری میں مختلف پھولوں کا ذکر کیا ہے۔غواصی نے ان پھولوں کی جو مصوری کی ہے وہ کمال کی ہے۔غواصی کے یہ خیالات سرزمین ہندوستان سے نہیں ہے بلکہ ملک مصر سے ہے جس کو غواصی نے اپنی شاعری میں مثنوی کے روپ میں پیش کیا ہے۔غواصی کی منظر نگاری صاف اور پاکیزہ ہے جس میں مبالغہ کا کوئی بھی دخل نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غواصی کا تعلق سرزمین ہند سے رہا تھا

لیکن اپنی ''سیف الملوک وبدیع الجمال'' کے سارے کرادر مصر سے ہے۔اس لئے غواصی کی مثنوی میں صداقت کا رنگ موجود ہے۔

غواصی کے دور سے تعلق رکھنے والے صنعتی ہیں جس نے حکومت گولکنڈہ میں شاعری کی ہے۔ اِن کی ایک مثنوی ''قصہ بے نظیر'' کے نام سے ہے اس مثنوی میں مختلف جگہ پر منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔صنعتی نے ''قصہ بے نظیر'' میں باغ کا نقشہ خوبصورت انداز سے کھینچا ہے اس میں بہت سے کرداروں کو سامنے لایا ہے لیکن جو اہم کردار ہے وہ تمیم انصاری ہے۔تمیم انصاری ایک مقام پر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ بے ہوش ہونے کے بعد گر پڑے اور بعد میں ایک مرغ ان کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔اس وادی میں ایک لہلاتا ہوا باغ تھا۔اس باغ کی منظرکشی یوں کی ہے۔

تھا واں عجب سبز یک مرغ زار درختاں تھے کئی بھانت کے باروار

جیسے سبز رنگ آسماں سی زمین ستاریاں سے اس میں گل یاسمین

دسیں پیچ سبنل کے لاے میں یوں عروساں کے رخسار پر زلف جوں

ہر یک بات پر بوند برسانت کے

ہر یک شاخ پر مرغ کئی بھانت کے

(قصہ بے نظیر،صفحہ۵۵)

مذکورہ اشعار میں آپ نے جس باغ کا منظر پیش کیا ہے اس کا تعلق سرزمین ہند سے نہیں بلکہ عرب کی زمین سے ہے۔جس میں لال، یاسمین،گل وغیرہ پھول کھلے ہیں۔ یہ شاعری خیالی نہیں بلکہ صنعتی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔اس طرح کہہ سکتے ہیں صنعتی نے جو منظر نگاری اپنی شاعری میں پیش

کی ہے یہ مبالغہ اور تصنع آدرد سے بالکل پاک ہے۔صنعتی نے اپنی شاعری میں تخیلی رنگ کو بھی اپنایا ہے۔

ابن نشاطی نے ایک مثنوی ''پھول بن'' کے نام سے لکھی ہے۔نشاطی نے اپنی شاعری میں فطرت کے مختلف مناظر پیش کیے ہیں۔پھول بن'' میں ایک درویش کے کردار کو سامنے لایا ہے اس میں گل وبلبل کی شادی کا تذکرہ بھی ہے۔ابن نشاطی نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بناپر ایک باغ کی تصویر کو کھینچا ہیں۔اس باغ میں منظر نگاری کی کافی عمومیت موجود ہے جس میں موسم بہار کی ذکر بھی ہے۔

نکل کر مر ماہی کے شکم تے　　　　ہو ا ہے مغروق غم تے

دیا سوئیض بھر جگ کو دو چنداں　　　　ہوئے پھولاں شگفتے ہور خنداں

اُٹھیا تھا پھول کا سب ٹھار مہکار　　　　کھلے تھے پھول جھاڑوں پر اک ٹھار

دے یوں پھول میں لالے کے کالے　　　　چوا جیوں لعل کے پیالے میں گھالے

پڑے دکھ بلبلاں آنے کے ہورلاں　　　　نئے شبنم کے موتی گل کے پھولاں

کرے سوں بلبلاں سن نغمہ سجنی

لگیان سب کو ملاں گانے کر سجنی

(پھول بن،صفحہ۳۸-۳۹)

مذکورہ اشعار میں پھولوں،لال پرندوں اور بلبل وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس پھول اور اس پرندے کا تعلق مشرق سے ہوتا ہے اِن اشعار میں اپنی تخیل کی بنیاد پر باغ کا نقشہ کھینچا ہے جو کامیاب بھی ہوا ہے۔

دکن کے شعرا میں محمد قلی قطب شاہ کے بعد نصرتی بہت بڑے منظر نگار شاعر نظر آتے ہیں۔نصرتی نے ایک مثنوی ''گلشن عشق'' کے نام سے لکھی ہے۔جس میں منظر نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔نصرتی بیجاپور میں علی عادل شاہ کے درباری شاعر تھے۔مثنوی ''گلشن عشق'' کا تعلق سرزمین ہند سے تھا۔اس میں جتنے بھی کردار سامنے لائے ہیں سارے ہندوستانی تھے۔اس لیے نصرتی کی منظر نگاری غیر ملکی نہیں ہے۔''گلشن عشق'' میں ایک جگہ پر صبح کی منظر نگاری نہایت ہی کامیاب ہے۔

صبا مشرق کے پال تے تھوک نکالیا جو کنچن کی جب تم نے لوک

ابلتا نکل نور کا نیر بت ہوا ریز عالم میں چوندھیر سب

کہ تھا سو یو جگ کا حوض غدیر بھر پاشش جہت سر تے کچن کا نیر

سپاہی کو چھاتی تے دھو یا فلک زرافشاں کسوت تے پکڑ یا جھلک

کوڑاں کھلے خلق کی نین کے

دھرے سد جو مخمور تھے رین کے

(گلشن عشق،صفحہ۸۰،۸۱)

نصرتی نے اپنے منظر نگاری میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی اس دنیا کو حوض غدیر کہا ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ یہ دنیا خوبصورت ہے وہ اپنی دکنی زبان میں سورج کی روشنی کو سونے کے پانی سے تشبیہ دیتا ہے۔مذکورہ اشعار میں نصرتی نے صبح کا منظر پیش کیا ہے اور یہ منظر نگاری نہایت ہی سادہ انداز میں ہے۔نصرتی نے اپنی منظر نگاری میں حُسن پیدا کیا ہے یہ حُسن تشبیہات اور استعارات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔اس طرح سے نصرتی کی منظر نگاری میں محاکات کے ساتھ تخیل بھی

داخل ہوجاتی ہے۔

ستے یوں زمین پر ہوا برف رچ   کیے ہیں مگر فرش بلور گچ

اوک دے کی سردی کا آزار ہو   نہالاں اتھے ٹھنڈسوں بیمار ہو

تھا نزع میں جیو ہر اک پات کا   کلیاں میں نہ تھا خندہ خوش دھات کا

نہ سکتی تے ہو کونپلی سرفراز   نہ ٹک ہو سکے بیل کا بہت درواز

چھلیاں سو اوڑ ٹو پن لحاف   ہوا تھا سو اس پر ذریخ خلاف

اُڑ لے تو پنکھی تُس کدھن پر جھٹک

پڑے برف سوں ہو گولا اٹک

(گلشن عشق، صفحہ ۱۴۰)

مذکورہ اشعار میں نصرتی نے سردی موسم کے حوالے سے بات کی ہے۔ یہاں پر اس نے بہت خوبی کے ساتھ تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے۔ اِن کے تشبیہات واستعارات میں ابہام کا گُرا چھایا نہیں ہوا ہے بلکہ ان سے منظر نگاری کے تصوارت واضح اور روشن ہوجاتے ہیں۔ دراصل یہ نصرتی کی منظریہ اشعار میں اصلیت اور حقیقت کا رنگ موجود ہے۔ وہ خود یہ بات لکھتے ہیں کہ سردی کی شدت سے بہت تکلیف ہوتی ہے درخت کے جتنے بھی شاخے ہیں سب ٹھنڈ پڑے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہوگئے۔ اِن کی اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اُن کا مانا ہے کہ جو کونپلے ہیں اُن میں اتنا دم نہیں تھا کہ سر اُٹھا سکیں اور نہ بیل ہاتھ دراز کرسکتی تھی۔

نصرتی کی منظر نگاری شاعری میں مبالغہ نہیں ہے اس نے اپنی شاعری میں تعلیل حُسن بھی استعمال

کیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ درختوں کے شاخوں میں جو تکلیف ہے وہ پتوں میں چھایا ہوا ہے۔ اپنی اردو شاعری میں فارسی شعرا کی طرح اپنی تخیل کو بے لگام نہیں چھوڑ دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی منظر نگار شاعری کی بڑی اہمیت ہیں وہ اپنی مثنوی ''گلشن عشق'' میں گرمی اور موسم کی بھی منظر کشی، دھوپ اور تمازت کو آفتاب کا بھی بیان کرتے ہیں۔

جوانی سون تھی دھوپ روت میں　　سورج تھا مگر آخر جوت میں

نہ کہہ سور بل آگ کا بادل تھا　　نہ دھوپ یک آتش جل تھا

مگر کھنچ دوزخ کے دریائے نیل　　برستا تھا جگ پہ چلتا تھیر

کرن ہے سو سب جل کہاں ھاریاں دسیں　　ہر ذرہ قطرات باراں دسیں

زمین نے فلک لگ سب اک دھات سوں

بھرے سردر آتش کی برسات سوں

(گلشن عشق، صفحہ ۱۴۹)

نصرتی نے مذکورہ اشعار میں گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے یہی اس کی اصلی مصوری کی حقیقت ہے۔ نصرتی سورج کو آگ کا بادل کہتا ہے اور ساتھ ہی دھوپ کو آگ کا پانی بتا تا ہے۔ ان اشعار کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ دوزخ کے دریائے نیل سے کھولتا ہوا پانی کھینچ آیا تھا جو لگا تار اس دنیا میں برس رہا تھا اور جس کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی انتہا۔ ان منظر یہ اشعار کو نصرتی نے نہایت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور یہ اشعار اردو شاعری میں نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک جگہ پر نصرتی نے باغ کی مصوری خوبصورت لفظوں میں کیا ہے۔ نصرتی کی یہ مصوری زیادہ کامیاب ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

فرخ بخش یک سبز تر باغ تھا　　فلک کو ہر اک پھول جس داغ تھا

سٹیس عکس سو تس منور چمن　　ستارے بھریا ہو ہر یو لگن

نقشہ دھڑی لالہ لعل بتاں　　سرنگ گال جیسے گل ارغواں

چندر گل تے چندر کی چھاتی پہ داغ　　کہ گل سور تے سور کا زرد باغ

گل اورنگ کا پختہ یوں روت کا　　کہ جیو پاج میں کام یاقوت کا

نگہ رکھ نہالاں اتھے کاچ کے

نہ چمناں کے نغمے اکھنڈ پاچ کے

(گلشن عشق، صفحہ ۱۸۵،۱۸۶)

مذکورہ اشعار میں منظر نگاری نہایت ہی عمدہ ہے۔جس میں لالہ،گل،ارغواں،سورج مکھی گل چاندنی اوررنگ کا ذکر ہے۔وہ پھولوں کے نام ایک سادہ انداز سے بیان نہیں کرتے ہیں بلکہ اِن پھولوں کو تشبیہ کے رنگ میں کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔وہ لالہ گل کو معشوق سے تشبیہ دیتے ہیں اس طرح نصرتی اپنی مصوری کے لفظوں کو حسین بنادیتے ہیں آپ نے باغ کی جو مصوری کی ہے باغ میں پرندوں کا نام الگ الگ لیا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اِن پرندوں کے رنگ و روپ کا ذکر کیا ہے اور ان کی خصوصیت کو بھی بیان کیا ہے۔ایک اور جگہ پر نصرتی نے پرندوں کے مختلف رنگ و روپ کو اپنی شاعری کے ذریعے سے پیش کئے ہیں اس میں یہ بتایا ہے کہ پرندوں نے یہ رنگ کہاں سے حاصل کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

پنکھیرو یہ سٹنے کون رنگ صبح گاہ

کتنے گل کے کانسے بھر دیا رنگ گاہ

لے لالہ کے کانسے کتنا بھر لے

سرنگ اپنی سرخاب چولی کر لے

(گلشن عشق، صفحہ ۱۸۸، ۱۸۹)

نصرتی لکھتے ہیں کہ جب صبح ہوتی ہے تو پرندوں پر رنگ پھینکے کے لیے چاند نے شب کے وقت بے شمار پھولوں کے کانسے بھر دیئے ہیں۔ یہ جتنی بھی ندرت اور جدت نصرتی کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔آپ نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔اس بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اس بایان میں نصرتی نے اپنے پرندوں کے سکنی نام لکھے ہیں جن کی شناخت بڑی مشکل ہے''

(نصرتی، صفحہ ۵۸، ۵۹،)

نصرتی نے نہ صرف پرندوں کی تفصیل کو بیان کیا ہے بلکہ باغ میں جتنے قسم کے میوئے موجود ہے۔ اُن کا بھی الگ الگ ذکر کیا ہے۔ بہرحال اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مصورانہ شاعری میں نصرتی بے مثل ہے۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں مختلف مشہور دکنی شعرا کی منظر نگاری سے بحث کی ہے۔منظر نگاری کی ترقی پہلے سے ہوئی ہے۔اس بارے میں ہم نے مشہور شعرا کی ذکر بھی کیا ہے۔ دکن کے مشہور شعرا نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے بیان میں تصنع وتکلف اور آدرد کو دخل نہیں کیا۔اور نہ ہی اپنی شاعری میں بے قافیہ پیمائی سے کام لیا ہے۔وہ اکثر اپنی شاعری میں حُسن تعلیل استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ

سے اردوشاعری کے حسُن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ دکن کے اِن مشہور شعرا نے اپنی شاعری میں مشاہدات سے کام لیا ہے۔محمد قلی قطب شاہ لے کر نصرتی کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ان شعرا کے درمیان کسی قسم کا خلانہیں ہے بلکہ ان شعرا نے مناظر قدرت میں کھو جانے کی کوشش کی ہے کچھ شعرا نے مناظر قدرت کواپنی آنکھوں سے دیکھانہیں ہےاور ہندوستانی مناظر کواپنی شاعری میں جگہ دی ہے ان شعرا نے اپنی ذاتی تجربہ کی بنا پر ہندوستان کے مناظر قدرت کوصحت اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ملاوجہی اور نصرتی کے یہاں ہندوستان مناظر قدرت کاعکس موجود ہے۔ان دنوں شعرا نے منظر نگاری میں کامیابی حاصل کی ہے۔ خاص طور سے نصرتی کے نام کومنظر نگاری کے ادب سے علحیدہ نہیں کیا جاسکتا ہے کچھ دکنی شعرا اس قسم کے بھی ہیں جنھوں نے دیگر مما لک کے منظر نگاری کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے غواصی، صنعتی اورابن نشاطی وغیرہ کا نام اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہے۔انھوں نے اپنی تخیل بناپر دیگر مما لک کے مناظر کونظم کیا ہےان کی منظر نگاری قیاسی اورفرضی ہے۔ بہرحال ابتدائی دور میں دکنی شعرا نے منظر نگاری کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے اور زیادہ تر شعرا نے منظر نگاری میں کامیابی حاصل کی ہے۔

عبوری دور

یہ دور ولی دکنی کی شاعری سے شروع ہوتا ہے۔جب ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے شعرا دیوان کو دیکھ کر کافی متاثر ہوئے ہیں۔بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری''اور ایسی شاعری سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ خود ولی کی شاعری دہلی کے شاعرانہ فضا سے متاثر ہوئی تھی اور اس کا لچر پن آ کر دور ہوا۔ولی دکنی کے جو شاعری کا انداز تھا وہ دکنی شعرا کی طرح تھا۔ولی دکنی دو مرتبہ دہلی گئے پہلی بار ولی دکنی کی ملاقات اورنگ زیب ۱۱۱۳ء میں اس وقت شاہ اسداللہ خان گلشن سے ہوا اور ساتھ ہی گلشن نے ان کا کلام دیکھا ہے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔اسی دور سے اردو شاعری اُبھری ہے اردو شاعری میں کافی کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔اردو شاعری میں تصنع وآورد تھا ولی نے ان کو اپنے دور میں ترک کیا ہے نئے انداز میں لکھنا شروع کیا ہے ولی دکنی سے کافی شعرا متاثر ہوئے جس سے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اردو شاعری پر اثر پڑ گیا ہے۔اردو شاعری میں دکنی رنگ بالکل بدل گیا ہے اس وقت کے جتنے بھی اردو شعرا موجود تھے انھوں نے دکنی زبان کر ترک کر کے فارسی اور اردو زبان میں اپنا کلام لکھنا شروع کیا ہے۔جن میں سراج اورنگ آبادی،عزلت،عاجز،فائز،وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔خود دہلی کے شعرا نے ریختہ میں شاعری شروع کر دی ہے۔ان میں سراج علی خان آرزو، شریف،امید،میر شمش فقیر،شاکر ناجی،یک رنگ،شاہ مبارک آبرو،شاہ حاتم وغیرہ کا نام ہے بہر حال

دکن والوں نے اُردو شعرا کے لئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس پر شمال کے شاعروں نے عمارت تعمیر کی ۔اوراس عمارت کے پہلے اینٹ لگانے والی شاعر کا نام ولی دکنی ہے۔

ولی دکنی کی شاعری پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی دکنی نے اپنی شاعری میں مختلف رنگ پیدا کئے ہیں۔ ولی نے بھی منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہے ۔ولی نے اپنی شاعری میں ایران اور ہندوستان کے تصوارت دکھائے ہیں ۔اور ساتھ ہی اردو شاعری میں خوب تشبیہات کی آمیزش کی ہے جس کی وجہ سے شمال والوں کے ذہن میں ہلچل پیدا ہوگئی ہیں۔دکن والوں کی طرح ولی دکنی نے بھی اپنی شاعری میں منظر کشی کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اپنے اشعار میں منظر نگاری کی خوب تعریفیں کی ہے ولی لکھتے ہیں۔

حُسن کے خضر نے کیا لب ریز — آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

جنت حُسن میں کیا حق نے — حوض کوثر مقام تجھ لب کا

رگ یاقوت کے قلم سوں لکھیں — خط پرستان پیام تجھ لب کا

سبز و برگ لالہ رکھتے ہیں

شوق دل میں دوام تجھ لب کا

(ولی دکنی تصوف،انسانیت اور محبت کا شاعر،صفحہ ۱۶۷)

مذکورہ اشعار میں ولی نے آب حیواں،حسن خضر،سبز و برگ اور حوض کوثر جیسے لفظوں کو پیش کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہیں کہ شمالی ہند کے دور اول میں ولی نے منظر نگاری کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ۔آپ نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ ولی نے اپنی شاعری کو

حسین و دلکش بنایا ہے اِن کی شاعری میں روایت سادگی ،روانی ،حقیقت تصویر نگاری، شیرینی کلام اور چمک دمک ہے جب ولی نے جدید شاعری کا خیر مقدم کیا ہے تو قدیم شاعری کی روایت ختم ہوئی ہے ۔یہی سے جدید شاعری بھی اُبھری ہے۔ ولی دکنی کی شاعری کو پڑھ کر ہندوستانی فضا کی خوشبو ،دل ودماغ کو متاثر کرتی ہے اور ساتھ ہی ہندوستانی باغات کی تصویر کشی ،کھیت کی منظر کشی ،مختلف پھولوں کی منظر کشی وغیرہ کو سیراب کراتی ہے جس کی وجہ سے ولی دکنی کی شاعری میں تازگی اور دلکشی پیدا ہوئی ہے۔

کیا تجھ نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ   کہ آتش گل کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتش غم کوں   کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں   خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کو کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں   کہ جوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سے آتا ہے روشن جبیں گھر سوں   کہ جوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رخ دل مہربانی   کہ جوں لگتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

ولی دل میں آتا ہے یار بے پروا

کہ جوں انکھیاں میں آتا ہے جواب آہستہ آہستہ

(ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر، صفحہ ۱۶۷)

ولی دکنی کا ہر ایک شعر اپنے موضوع اور منظر کے لحاظ سے جذبات انگیز ہے۔لیکن ولی دکنی نے عشق سرشاری کے اس منظر کو ایسی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔کہ منظر نگاری کی بے مثل تصورات اُبھری

ہے۔آپ پہلے شاعر ہے جس نے اپنی شاعری کو نیا رنگ وآہنگ دیا ہے اسی لئے آپ کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔آپ نے اردو شاعری کو بہترین ماڈل بھی قرار دیا ہے۔آپ نے غزلوں میں ایرانی رنگ کے تصورات کے ساتھ ساتھ ہندوی تخیل اور جمال کا بھی اظہار کیا ہے۔وہ ہندوی زبان کے بھی شاعر تھے اس نے اردو شاعری کو بھی مالا مال کر دیا ہے۔ولی کی شاعری میں محبوب کی منظر نگاری دیکھتے ہیں:

چمن میں جب چلے اس حسنِ عالم تاب سوں اٹھ کر
کرے تعظیم خوشبو پر گل سیراب سوں اُٹھ کر
تیرے آبرو کی گر پہنچے خبر مسجد میں زاہد کوں
تماشا دیکھے آوے تیرا محراب سوں اُٹھ کر

(ولی دکنی تصوف،انسانیت اور محبت کا شاعر صفحہ ۱۲۴)

ولی کے دور سے شمالی ہند کے شعرا اہل دہلی کی شاعری سے متوجہ ہوئے ہیں۔جن میں کچھ اہم نام قابل ذکر ہے۔جیسے آبرو،حاتم،مظہر جان جاناں،مضمون اور میر عبدالحی تاباں ہے۔مظہر جان جاناں نے اردو شاعرئی کو ایہام گوئی سے ہٹا کر فطری شاعری کی طرح موڑ دیا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کو جگہ دی ہے۔اِن کی ایک غزل میں بہار کی تصور کشی ہے۔

ہم نے کی ہے توبہ اور دھو میں مچائی ہے بہار ہائے بس چلتا نہیں کیا صفت جاتی ہے بہار
لالہ وگل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور کیا قیامت ہے کہ موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
نرگس وگل کی دکھو کلیاں کھلی جائی ہیں سب پھران خوابیدہ مستوں کو جگاتی ہے بہار

شاخ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

(میر وسودا کا دور،صفحہ ۱۲۰)

میر عبدالحی تابان کی شاعری میں منظر نگاری:

جُھکی ہے فوج گل اور عندلیباں کی بہار آئی ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھو دیوانے بہار آئی
نہ جانوں صبح دم باد صبا کیا جا پکار آئی کہ غنچے کا دل نازک چمن بیچ پھاڑ آئی

کیا بلبل نے نالہ ،آہ قمری نے روئی شبنم
خدا باغ میں آئی قیامت یا بہار آئی

(میر وسودا کا دور،صفحہ ۳۰)

ولی دکنی کے دور سے تعلق رکھنے والے ایک اور شاعر کا نام سراج اورنگ آبادی ہے۔سراج اورنگ آبادی نے شاعری بھی کی ہے اور مثنویوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔سراج اورنگ آبادی نے منظر نگاری کو اپنی مثنویوں میں جگہ دی ہے۔ اِن کی ایک مثنوی ''بوستان خیال'' کے نام سے ہے اس میں منظر نگاری کے مختلف تصوارت دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

رواں آب ہر طرف آبشار جدہر دیکھے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا تماشہ تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک سروپرعشق پیچے کی بیل خوش کے گلے کی تھی گویا جمیل
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں خم زلف لیلے کے افسوں کی تھیں

ادھر بلبلوں کی غزل خوانیاں اُدھر پھول کی شبنم افشانیاں

اِدھر ورعنا کے سبزے کی دھوم اُدھر نغمہ قمریوں کا ہجوم

نپٹ جھوم آیا تھا ابر بہار

برستی تھی باریک چھم چھم بہار

(کلیات سراج اورنگ آبادی، صفحہ ۴۲)

اس مثنوی کے بارے میں خود عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

''اس مثنوی کا لطف مناظر کے مصورانہ بیانات، مرقعوں اور جذبات انسانی کی صحیح صورت گری ہے اگر روزمرہ کے اختلاف کو وجہ امتیاز بنایا جاسکتا ہے تو بوستان خیال کا دور جدید مثنوی سحرالبیان کے بعد ہے ورنہ اس کے بعض پارے سحرالبیان پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔''

(اردو مثنوی کا ارتقاء، صفحہ ۹۸)

اس کے بعد اردو میں ایک اور سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ جس کو ہم میر وسودا کا دور کہا کرتے ہیں۔ اس دور میں اردو شاعری نے کافی رنگ بدل دیا ہے۔ نئے نئے تصورات اردو شاعری میں شامل ہوگئے ہیں میر وسودا سے ہی اردو شاعری کا عہد زریں شروع ہوتا ہے میر نے اپنی زندگی غم و مصائب میں گزاری ہے۔ دوسری طرح سودا اس سے دور ہی رہے ہیں، سودا نے زندگی بھر عیش پرستی کا دور دیکھا ہے۔ اسلئے نہ وہ کسی دربار سے جڑے ہیں اور نہ ہی بادشاہوں کے دربار میں جانا پسند کیا ہے۔ میر تقی میر نے غزلیں، اردو مرثیہ اور مثنویوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے دوسری طرح اِن کا مقام

اردوغزل کے اول شعرامیں شمار ہوتا ہے۔اردو شاعری میں غزل ہی ایک ایسی صنف سخن ہے جو داخلی
وارادات اور قلبی مناظر کو دیکھاتی ہیں۔میر نے بھی اس سے اپنا رشتہ مستحکم کیا ہے۔صنف غزل میر تقی
میر کی ہمیشہ مشکور وممنون رہے گی۔میر کو اردوغزل میں شہنشاہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔اس کی سب سے
بڑی وجہ یہ ہے کہ میر نے اردوغزل کواونچے مقام تک پہنچادیا ہے۔میر غم کے شاعر ہے۔اِن کی شاعری
میں جذبات بھی ہے میر کو بھی اقبال کی طرح نیچر سے کافی لگاؤ تھا۔میر تقی میر منظر نگاری کے عنوان سے
لکھتے ہیں:

اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیان　　رکھتا ہی جیسے غنچہ زبان طوطہ زبان
یوسف کہ تھا نبی وصداقت شعار تھا　　پھر حسن ظاہری سی بھی باغ وبہار تھا
اے جھوٹ دل میرا بھی بہت دردناک ہے
ان کا ذبوں سی صبح سے حبیب چاک ہے

(کلیات میر تقی میر،۱۲۲)

سودا نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔قصیدے،مرثیہ،قطعہ اورغزل وغیرہ میں اپنا نام کمایا
ہے۔لیکن اردوادب میں ان کی پہچان قصیدہ نگاری کے روپ میں ہوئے ہیں۔سودا کو بھی مناظر فطرت
سے کافی لگاؤ تھا۔اسلئے نہ وہ کسی دربار سے جڑے ہے اور نہ ہی کسی بھی بادشاہ کے دربار میں جانا پسند کیا
ہے۔سودا الگ قسم کے مزاج رکھتے تھے۔اردو شاعری کے ارتقاء سفر میں ہم سودا کو بھول نہیں سکتے
ہیں۔انھوں نے میر کی طرح اچھے خدمات انجام دیئے ہیں۔وہ اپنی شاعری میں مناظر فطرت کی مدد
سے دنیا کی بے ثباتی پر روشنی ڈالتے ہیں۔سودا کا تعلق شمالی ہند کے صوبہ دلی سے تھا۔انھوں نے ایک

قطعہ منظر نگاری کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں دلی کی منظر کشی کو پیش کیا ہے۔ یہ قطعہ سودا نے تمثیلی انداز میں لکھا ہے۔

باغ دہلی میں جو اک روز ہو میرا گزر نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

محل بر باد پڑے سوکھی پڑی ہیں روش خاک اُڑتی ہی ہر اک سمت پڑے ہیں خس وخار

مسکراتا تھا جہاں غنچہ وگل ہنستا تھا اشک کے بھی قطرے کا نہیں وہاں آثار

جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سروشمشاد عندلیب ایک ہی ہے بال و پر دل افکار

یہ دم سرد بعد حسرت وصد سوز جگر دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہیں لالہ زار

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر د یدیم و بہار آخر شد

(کلیات سودا،صفحہ ۴۴۶)

اس میں سودا نے دلی کے ایک باغ کا نقشہ نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔اور اہل دلی میں جو غنچہ گل ہے ان کو سروشمشاد سے تعبیر کیا ہے۔ مذکورہ اشعار میں جو لفظ محل اور روشِ ہے ۔ یہ دونوں دلی کے گل اور کوچوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ سودا نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے تصورات کو پیش کیا ہے۔میر کے ساتھ سودا نے پورا تعاون کیا ہے اور دونوں نے اردو شاعری کی روایت کو قائم رکھا ہے۔جس سے آگئے چل کر بہت سے شعرا پیدا ہوئے ہیں۔

جب اردو شاعری میں انیس ودبیر کا دور شروع ہوتا ہے۔اردو شاعری میں رنگ بھی بدلنے لگتا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انیس ودبیر نے اردو شاعری میں غزل ونظم کے بجائے اردو

مرثیہ کی طرف توجہ دیئے ہیں۔یوں تو انیس نے اردو شاعری میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا نام اردو مرثیہ میں صف اول میں شمار ہوتا ہے۔مرثیہ اردو شاعری کی ایک مقبول ترین صنف ہے یہ اخلاقی تعلیم کی بہترین زیور ہے۔انیس نے بھی اپنے آپ کو اسی میں آزمایا ہے اور اپنا سر اُنچا کیا ہے۔انہوں نے اردو مرثیہ کو وسعت دی ہے۔

سب سے پہلے انیس کی بات کرتے ہیں جس نے اردو مرثیہ کو اپنی فطرت کے ذریعے فلسفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا ہے یہ دوسرے روپ میں منتقل ہوجاتا ہے۔دوسری طرح انیس نے بھی اپنی شاعری میں منظر نگاری کے تصورات کو دیکھایا ہے انیس نے کربلا کے شہیدوں کی منظر کشی کی ہے یہ منظر اپنے آنکھوں کے سامنے لایا ہے۔انیس نے اپنی شاعری کے ہر غم کو کربلا کے شہیدوں کے نذرانہ کے طور پر پیش کیا ہے۔اس کی مثال اِن اشعاروں میں ہے۔

باتیں یہ تھیں کہ صبح کا تا راعیاں ہوا　　مغرب کی سمت لشکر انجم رواں ہوا
وہ چند اور حسن رُخ کہکشاں ہوا　　تاچرخ سر بلند جو شور اذاں ہوا
دنیا تمام نور سے معمور ہوگئی
وہ رات صبح ہوتے ہی کافور ہوگئی

وہ پھولنا شفق کا وہ صحر وہ اسبزہ زار　　خود رو وہ گل کھلے ہوئے وہ موسم بہار
صحرا کے طائروں کا چہکنا وہ بار بار　　گلزار کربلا میں پپہے کی وہ پکار
جھونکے نسیم صبح کے فرات کی
تڑکا وہ نور صبح کا وہ خنکی وہ رات کی

چلنا صبا کا دشت میں نازاں وہ دم بدم　　پھیلی ہوئی وہ چار طرف نکہت اِرم
وہ بلبلوں کی زم زم پر دا زیاں بہم　　پنجہ کی وہ لچک وہ سر افرازی علم
باہم مقابلہ میں وہ لشکر کھڑے ہوئے
دونوں طرف نشانوں کے جھنڈے گڑے ہوئے

گل ہائے ارغواں کا مہکنا وہ بار بار　　بلبل کا عشق گل میں چہکنا وہ بار بار
بے خود صبا کا ہو کے بہکنا وہ بار بار　　سبزے کا بے خودی میں لہکنا وہ بار بار
شبنم سے تھا جو بھرا کٹورہ گلاب کا
دھویا نسیم صبح نے منہ آفتاب کا

(نقوش انیس صفحہ ۳۶۸)

انیس نے مذکورہ مراثی میں صبح کا منظر کشی بیان کیا ہے۔ یعنی صبح کا کارواں اور منزلیں کافی دور ہیں۔ انیس اپنے مرثیہ میں جب آسمان کی باتیں کرتے ہیں تب منظر نگاری بھی اپنی جزئیات سمت مکمل رنگ بے رنگ کے ساتھ ہماری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ اور جب یہ منظر زمین پر اُترتا ہے تو گلاب کے پھولوں کی تفصیل مل جاتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس میں ہمیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیابان وسحر　　دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اُوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر　　لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزہ پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی

صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو　　　دل کو اُلجھاتے تھے سنبل کے وہ پُرخم گیسو

قمریاں کہتی تھیں شمشاد یہ یاہو یاہو　　　فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کُوکُوکُو

وقت تسبیح کا تھا عشق کا ہر دم بھرتے تھے

اپنے معبود کی سب حمد وثنا کرتے تھے

(مراثی انیس، صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱)

انیس نے جو لفظوں کا انتخاب کیا ہے ایک دم صحیح ہے۔ انیس نے مرثیہ میں تشبیہات اور استعارات کے ساتھ محاروں کے برمحل استعمال کیا ہے جس سے شاعر کے فن اور رفعت کا پتہ چلتا ہے۔ میر انیس نے اپنی شاعری کے چند بند میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ کچھ لوگ دنیا میں بغیر کسی غم کے عیش آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہے جو موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ اس فلسفہ کو انیس نے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔

کچھ پھول دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے　　　کچھ سو کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے

کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے　　　غنچے بھے ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغان سے

کچھ بس نہیں چلتا چمن آرانے جہاں سے

(مراثی انیس، صفحہ ۱۹۲)

اردو مرثیہ کی تاریخ میں دوسرا نام مرزا سلامت علی دبیر کا ہے۔ جن کی مراثی میں منظر کشی کے بہت

ہی نادر نمونے ملتے ہیں۔ دبیر بعض اوقات میں منظر نگاری کرتے وقت آیات کا سہار لیتے ہیں۔ہم کی کی شاعرانہ قدر و قیمت سے بھی بخوبی آگاہ ہوجاتے ہیں۔ دبیر قرآنی آیاتوں کا سہارا لے کر یوں فرماتے ہیں۔

جب ختم کیا سورہ والیل قمر نے
اور صبح انجم کو لگا ہاتھ سے دھرنے
آغاز کیا آہینہ و الشّمس سحر نے
اور رو کے کہا فاطمہ خستہ جگر نے

(مرثیہ دبیر،صفحہ ۱۸۹)

انیس کی طرح دبیر نے بھی فطرت کے ذریعے مختلف فلسفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں منظر کو واضح کیا ہے۔انیس و دبیر سے پہلے شعرا نے اس مسئلہ پر غور کیا مرزا سلامت علی دبیر مرثیہ گوئی میں ایک اُستاد کامل تھے۔انیس کی طرح دبیر نے بھی تمام عمر اسی مشغل میں زندگی بسر کردی تھی۔مرثیہ کی تاریخی دور میں دبیر کا نام اہم مانا جاتا ہے۔دبیر کے کلام میں منظر نگاری کا نورانی سیلاب نظر آتا ہے۔ دبیر نے ہر ایک اشعار کو منظر کشی کے عنوان سے لکھا ہے۔اردو شاعری میں جس کو ہم منظر نگاری کہتے ہیں دبیر اور انیس کے بغیر نامکمل ہے۔مراز دبیر نے ایک جگہ پر صبح کی منظر کشی کی ہے۔

بوئے بہشت آتی تھی بادِ نسیم سے — گویا جہاں میں آتی تھی باغ نعیم سے
عنبر کی بو خجل تھی گلوں کی شمیم سے — شبنم کے دُر خوش آب تھے دُر یتیم سے

ایسی ہوا موافق گلزار ہوگی
جو تندرست نرگس بیمار ہوگی

تازہ کیا نسیم سحر نے چمن کا رنگ — لالہ بٹا رہا تھا عقیق یمن کا رنگ
تھا یاسمین کے پھولوں میں دُرعدن کا رنگ — غنچہ کی بُو سے اُڑتا تھا مشک ختن کا رنگ

کھل کھل کے پھول نافوں کی صورت مہکتے تھے
ذکرِ خدا میں مرغ خوش الحاں چہکتے تھے

(مرثیہ دبیر، صفحہ ۴۲)

مرزا سلامت علی دبیر نے ایک جگہ پر اردو شاعری کے دامن کو بہت وسیع کیا ہے۔ آپ کی منظر نگاری کمال کی ہے وہ لکھتے ہیں:

وہ روشنی وہ صبح وہ جنگل وہ بیابان — وہ سرد ہوا اور سحر قتل کا سامان
ہر مرتبہ جنبش میں بہم برگ درختاں — اور شاخوں پہ وہ زمرمہ مرغ خوش الحاں

خورشید کی تو جلوہ گری اوج سما سے
اور خیموں میں بجھنا وہ چراغوں کا ہوا سے

(مرثیہ دبیر، صفحہ ۱۰۸)

مذکورہ اشعار میں دبیر نے روشنی، صبح، جنگل، بیابان، اور سحر جیسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایسی مرثیہ پڑھنے کے بعد قاری اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس سے داد دینے کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔

افلاک کے یہ رہ رہ کے ستاروں کا چمکنا — مرغان سحر خیز کا شاخو ں پہ چہکنا

اورسبزہ خودروکو وہ ہر سمت مہکنا　　　اطفال کا خیمہ میں عطش سے بہکنا

تھا آب رواں بند جو اُس فوج خدا پر

لوگوں نے تیمیم کیا بس خاک ِ شفا پر

(مرثیہ دبیر،صفحہ ۲۰۲)

اقبال نے اردوشاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اس میں اپنا نام بھی کمایا ہے۔ اقبال کے کلام میں مناظر ومظاہر کی تصویریں مرکب ہیں۔ اقبال کے کلام میں موسم، پرندہ اور پالتوں جانوروں کی منظر کشی صاف طور پر دیکھائی دیتے ہیں۔ اقبال ان مناظر سے مست ہوکر اس میں کہیں دیر تک کھو جاتے ہیں۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کو ودمن　　　مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرامیں یا پریاں قطار اندر قطار　　　نیلے نیلے،اُودے اُودے پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادصبا

اور چمکاتی ہے اس موتی کوسورج کی کرن

(بال جبرئیل،صفحہ ۲۲)

ایک جگہ پر علامہ اقبال نے خوبصورت لفظوں کا انتخاب کر کے منظرنگاری کی ہے۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ　　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کوذرا دیکھ

اس جلوہ میں بے پردوں کو پردوں میں چھپادیکھ　　　بے تاب نہ ہو معرکہ بیم ور جائیے

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل گھٹائیں یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیش نظر کل فرشتوں کی ادائیں

آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ خورشید جہاں تاب کی وضو تیرے شرر میں دیکھ

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

اے پیکر گل کاشش پہیم کی جزا دیکھ

(کلیات اقبال، صفحہ ۴۲۴)

علامہ اقبال نے اپنی شاعری خوبصورت نقوش جا بجا پیش کئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی پوری شاعری منظر نگاری کے عمدہ نمونے اور نشانات بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری فطری پسند ی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے چاہنے والوں کو مناظر کی سیر کراتے ہیں۔ اقبال نے اردو شاعری کو منظر نگاری سے مالا مال کر دیا ہے۔ اِن کی اس منظر نگاری شاعری میں بہت واضح مثالیں موجود ہیں۔ اقبال کی اکثر وبیشتر غزلیں اپنے مجموعہ ''بال جبرئیل'' میں درج ہیں جن میں منظر نگاری کے دلکش نمونے پڑھنے کو مل سکتے ہیں۔ اِن کے دوسرے مجموعہ ''بانگ درا'' میں بھی منظر نگاری کے بہترین مرقعے سجائے گئے ہیں۔ زندگی کے مسائل، محبت کی واردات اور زمانے کے ناگریز حالات غزل میں دکھا کر منظر نگاری کی تصورات سامنے لائے ہیں۔ اس غزل میں چند اشعار دیکھتے ہیں۔

وہ میکش ہوں فروغ مہ سے خود گلزار بن جاؤں ہوائے گل فراقِ نا مہر بان تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوش نوائی تک رہی بجلی کی ہے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

وہ مشتِ خاک ہوں فیض پریشاں سے صحرا ہوں　　نہ پوچھو میری وسعت زمین سے آسمان تک ہے

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل

یہاں کی زندگی پابندی رسم فغاں تک ہے

(بانگ درا صفحہ ۱۰۲)

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے نمونے پیش کر کے بنی نوع انسان کو مختلف حالتوں اور نازک کیفیتوں کی طرح موڑ دیا ہے۔ انہوں نے منظر نگاری کے کسی بھی پہلو کو نہ چھوڑا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہر پہلو فلسفیانہ انداز میں ملتا ہے۔ اقبال کے ان خیالات کو سلام سندیلوی نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔

''اقبال نے فطرت کی مختلف اشیاء کو مجسم کر کے ان سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے بے جان چیزوں کو جاندار کرلیا ہے اور بے زبان اشیاء کو زبان دے دی ہے۔ اقبال کے یہاں اس قسم کی شاعری میں کافی تعداد ہے فطرت نگاری کے سلسلے میں زیادہ تر اُن کی نظمیں ایسی ہیں جن میں یا تو انہوں نے بے نطق چیز کو ناطق تصور کر کے اس کی زبان سے کسی فلسفیانہ نکتہ سے ظاہر کیا گیا ہے کہ دونوں بے جان چیزیں جاندار بن کر آپس میں گفتگو کر رہی ہیں اور اقبال کے نقطہ نظر پر روشنی ڈال رہی ہیں۔''

(اردو شاعری میں منظر نگاری، صفحہ ۴۶۴، ۴۶۵)

اردو شاعری میں منظر نگاری کا فروغ جدید دور میں بھی حاصل ہوا ہے۔ اس سے پہلے منظر نگاری کا

بہت بڑا حصہ مصنوعی اور رسمی ہے جس پر زیادہ فارسی کا گہرا اثر ہے۔لیکن بے وجود اس کے دور جدید میں انگریزی ادب کے اثرات شاعری میں شامل ہوگئے ہیں۔جس کی وجہ سے اردو شاعری میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔اور منظر نگاری کو بھی اصل رنگ و روغن حاصل ہوا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو شاعری میں زیادہ تر انسانی حُسن کو فطرت کے حُسن سے برتر قرار دیا گیا ہے۔یہ رجحان دور ابتداء سے دور جدید تک قائم رہا ہے۔یہ تحریکی رجحان اردو شاعری میں عام ہے۔اردو شاعری میں منظر نگاری کا رجحان زیادہ پیدا ہوگیا ہے۔جس کی وجہ سے دور جدید شعراء نے فطرت نگاری کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔فطرت نگاری کے ذریعے اردو شاعری میں لاجواب تصورات دیکھنے کو ملا ہے۔صرف انسانی صورت وشکل ہی نہیں بلکہ زمین وآسمان پر ترجیح دی ہے۔یہ داخلی بھی اور خارجی بھی ہے۔

اب مولانا الطاف حسین حالی اور اکبرالہٰ آبادی کی شاعری پر ایک مختصر نظر ڈالتے ہیں۔جہاں تک الطاف حسین حالی کی شاعری کا تعلق ہے۔حالی نے بھی منظر نگاری کی طرف توجہ کی۔آپ کی شاعری کو نیچر سے تعبیر کیا جاتا ہے اِس کی ابتداء بھی حالی نے کی ہے۔اِن کے کچھ اشعاروں میں منظر نگاری دیکھنے کو ملتا ہے۔اس نے ایک مثنوی ''مثنوی موسم گرما کے عنوان سے لکھی ہیں۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ بہ رنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں ،کہیں ہیں کالے
ہے چرغ پر چھاوَنی سی چھاتی — اک آتی ہیں فوج ایک جاتی
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی — آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

باغوں نے کیا ہی نحل صحت　　کھیتوں کا ملا ہے خلعت

باغوں نے کیا ہی پٹی ہوئے ہیں کہار　　دُولھا سے بنی ہوئے ہیں اشجار

کائل کی ہے کوک دل بھلاتی　　گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آئے

سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے

(دیوان حالی،صفحہ ۴۵)

مذکورہ اشعار میں برسات کا جو سماں سادہ لفظوں میں پیش کیا ہے، ہر منظر دلکش ہے۔کوئی بھی شے اجنبی نہیں ہیں۔شاعر نے موسم برسات کا نقشہ واضح الفاظ میں کھینچا ہے۔ برسات کا یہ نقشہ قصیدہ کی تشبیب میں ملتی ہے ۔مولانا حالی نے برسات سے لطف اُٹھا کر منظر نگاری شاعری کا پورا مزہ لیا ہے۔ برکھارت میں ہی ایک جگہ پر چند اشعار بیان کرتے ہیں۔

گرمی کی تپش بجھانے والی　　سردی کا پیام لانے والی

قدرت کے عجا ئبات کی کان　　عارف کے لیے کتاب عرفان

(دیوان حالی،صفحہ ۴۵)

حالی جدید شاعری کے بانی تھے ۔آپ کی شاعری دلکشی ،رنگینی اور سلاست کی وجہ سے ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔حالی کی نیچرل شاعری مبالغہ اور صنائع بدائع سے بالکل پاک ہے اِن کے کلام میں باتیں نہایت ہی صاف اور سادہ زبان میں لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حالی نے

اردو شاعری میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ان کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے اردو شاعری کو بامقصد بنانے میں جدید رجحانات سے آشنا کیا اور اپنی شاعری میں سادگی، سچائی اور پاک دامنی کے قریب لانے میں نمایاں کام انجام دیا ہے وہ اپنی شاعری میں وطن اور انسانیت کی بیش بہا خدمت کرتے ہوئے لکھتے ہے:۔

یہی عبادت ہے یہی دین وایمان

کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان

حالی نے اپنے شاعری میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب کیا ہے بلکہ آپ کی شاعری میں مذہبی اور اصلاحی نظمیں بھی ہیں۔آپ کی شاعری میں خشک بے مزہ اور تعلیمی ڈھنگ ہے۔ان کی شاعری میں دلکشی بھی ہے خاص کر ان کی حسن وعشق، وصال ورادات، قلب ، کشمش حیات، بے ثباتی عالم، بے مہر زمانہ، معشوق کی بے وفائی، آہ اور رشک، واز وگداز، حسرت وآرزو، گردش وایام اور امید ویاس جہاں ان کے موضوعات پر بہترین اشعار ملتے ہیں۔ وہاں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو اِن کے ضرب مثل بن چکے ہیں۔حالی کی غزلوں کے اشعار میں زندگی کے کتنے ہی پہلو اور کتنے ہی رنگ نظر آتے ہیں۔ان کے اشعار اس بات کی گوائی دیتے ہیں کہ حالی مصلح قوم ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک منفرد غزل گو شاعر اور جذبات نگار شاعر بھی تھے۔ان کی شاعری فارسی گو شاعر شیخ سعدی شیرازی سے بہت ملتی ہے۔

اکبر الہٰ آبادی کی شاعری پر ایک مختصر جائز لیتے ہیں۔اکبر کا نام اردو شاعری کے مکرم شعرا کی فہرست میں ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔انہوں نے منظر نگاری میں ایک بہت ہی قابل قدر مثال پیش کیا ہے انھوں نے ایک نظم ''روانی آب'' کے عنوان سے لکھی ہے کہ جس میں پانی کا بہاؤ، اس کی لہروں کی

تلاطم وغیرہ مدجزوں کو یوں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا — چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا — یہ سبزے پہ چادر بچھاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا — یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا — اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا — ہر اک سے برابر اُلجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا — ہوا کے طماچوں کو ہستا ہوا
بلندی سے گرتا، گراتا ہوا — نشیبوں میں پھرتا، پھراتا ہوا
وہ کھیتوں میں رائیں کترتا ہوا — زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا — وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا

(کلیاتِ اکبر، صفحہ ۴۴۵،۴۴۴)

دورِ جدید کی اردو منظر نگاری شاعری پر مغربی شاعری کا گہرا اثر موجود ہے۔ یہ ایک ایسی ہی صورت ہے کہ اکبر الہٰ آبادی کے زمانے میں برابر جاری رہی ہے اکبر نے یہ نظم مغربی طرز پر لکھی ہے۔اس میں اکبر کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اس قسم کی مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اکبر الہٰ آبادی زبان و بیان پر کامل دسترس

رکھنے کے ساتھ ساتھ فطرت کا صحیح عاشق اور مناظر فطرت کا بہترین نقاش تھا۔یہی اکبر کی اصل پہچان ہے۔

اب ہم فیض احمد فیض کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں فیض ایک بلند پایہ شاعر ہیں انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے زیادہ متاثر تھے۔آپ نے اپنے آپ کو اسی انقلاب سے جوڑا ہے فیض احمد فیض نے اپنے اشعار کو انقلابی نعرہ سے تعبیر کیا ہے اس نے ''منظر'' کے عنوان سے اپنے اشعار میں منظر نگاری کی ہے:

رہ گزر سائے ،شجر منزل دور،حلقہ بام　　　بام پر سفینہ مہتاب کھلا آہستہ

جس طرح کھولے کوئی بند قبا آہستہ　　　حلقہ بام تلے،سایوں کا ٹھرا ہوا نیل کی جھیل

نیل کی جھیل نیل کی جھیل　　　جھیل میں چپکے سے تیرا کسی چپاتے کا

ایک پل ،تیرا ،چلا ،پھوٹ ،گیا آہستہ　　　بہت آہستہ ،بہت ہلکا ،خنک رنگِ شراب

میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ　　　شیشہ و جام ،صراحی ،تیرے ہاتھوں کا گلاب

جس طرح دور کسی خواب کا نقش

آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ ۴۴)

فیض احمد فیض نے اپنی شاعری میں خوبصورت خوابوں اور نئے سپنوں کا سہارا لے کر منظر نگاری کی جدید روایت کو قائم رکھا ہے۔فیض نے اپنی شاعری میں عمدہ مثالیں دی ہے جس سے ہماری نظروں کے سامنے منظر کشی کا دلکش سماں پیدا ہوا ہے۔جیسے برف ،شاعر بارش ،کوئل ،نیل ،باغ ،پتا ،شجر اور موتی

کرن ہے۔فیض احمد فیض نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کی کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جدید اردو شاعری میں اِن کا نام بھی ہم مانا جاتا ہے۔

برکھا برسے چھت پر،میں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر،میں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں
آئے اور اُڑ جائے، میں تیرے سپنے دیکھوں
باغوں میں پتے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
شبنم کی موتی دیکھیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ ۴۶۹)

فیض احمد فیض کو راولپنڈی کے سازش میں گرفتار کیا گیا تھا۔اس نے کئی راتیں جیل کے اندر کاٹی ہیں۔ وہ جیل کے اندر رنگ کے ساتھ بو کو بھی دیکھ رہا ہے اور باغ و بہار کے مناظر کو بھی دیکھتا ہے۔وہ جیل میں سوچتے ہیں کہ سوئے ہوئے عوام کے دلوں میں جوش پیدا کیا جائے۔ وہ گرمی کی حرارت سے دو چارہ ہو جاتے ہیں۔

لاؤ سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار
طیش کی آتش جوار کہاں ہے لاؤ
وہ دیکھتا ہوا ، گلزار ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے حرارت بھی ہے توانائی بھی

منظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر
ان شعلوں کی اجز اپنا پتہ دیں گے
خیر ہم تک وہ پہنچے بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح پتہ تو دیں گے

(نسخہ ہائے وفا، صفحہ ۲۸۶)

مذکورہ اشعار میں انقلابی اور جوشیلی جذبات کو جامعہ پہنا کر اردو شاعری میں منظر نگاری کا ایک نہایت ماحول قائم کیا ہے۔

صبح پھوٹی تو آسمان پہ تیری
رنگ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

(نسخہ ہائے وفا، صفحہ ۲۷۷)

فیض کی شاعری میں تمثیل نگاری ملتی ہے ۔اِن کی شاعری ترنم وموسقیت سے پوری طرح لبریز ہے۔اس کے علاوہ پرُ لطف تشبیہوں واستعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر کو تراشتے ہیں ۔اِن کے موضوعات میں آفاقیت ہے۔ان کی ہمدردیاں بھی نہایت وسیع ہیں۔وہ اپنی شاعری میں لفظوں کا دلکش انتخاب کرتے ہیں۔اِن کی خالص انقلابی شاعری میں موسقیت اور وزن کا اتار چڑھاؤ ہے جو اپنے کلام کو دلکش فن پارہ بنا دیتا ہے۔فیض نے ایک نظم ''بول'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں یہ سارے

چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس نظم کے اشعار کچھ اس طرح ہیں۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے　　بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا　　بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکاں میں　　تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے　　پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے　　جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک　　بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ۸۱)

اردو شاعری کو ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔اردو شاعری میں حسن و عشق کے مختلف انداز جلوہ گر ہوتے ہیں۔اس میں خیالات وجذبات کی رنگارنگی بہت شدت کے طور پر نظر آتے ہیں۔اردو شاعری میں مختلف اصناف ہے ۔ مثلاً مثنوی،قصیدہ،غزل اور رباعی موجود ہے ان سب نے اردو شاعری میں انقلاب پیدا کیا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اردو غزل کا جو رنگ پایا جاتا تھا وہ بدل گیا اور جدید شاعری کا دور شروع ہوگیا۔دور جدید کی شاعری میں بھی منظر نگاری ہے۔جن شعرا نے اپنی شاعری میں تصورات دکھائی ہے ان میں فراق گورکھپوری،فیض احمد فیض،وزیر آغا،ناصر کاظمی اور پرین شاکر موجود ہیں۔یہ کچھ چند اہم نام ہیں۔جھنوں نے اپنی شاعری میں رنگ برنگ منظر کشی کی ہے۔اردو شاعری میں یہ طویل عرصے تک جاری وساری ہے۔فراق گورکھپوری جدید عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں۔فراق کی غزلوں میں زندگی کے لمحات نہایت باریکی کے ساتھ پیش پیش

ہے۔وہ اپنی زندگی کے لئے نغموں اور رنگوں کو آپس میں ملا کر ایک خوشگوار سماں پیدا کرتے ہیں۔

فراق ہمارے عہد کے ایک عہد آفرین غزل گو شاعر ہیں۔آپ کی شاعری میں ہندوستانی موسموں کی ذکر ہے اور خزانوں کی تفصیل ہے۔اِن کو موسموں کے ساتھ زیادہ لگاؤ رہا ہے۔وہ اکثر ان ہی موسموں سے مخاطب ہوکر اس سے چلے جانے کی تاکید کرتے ہیں تاکہ خزان کی وجہ سے گلستان میں ویرانی کی جو حالت طاری ہوجاتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح رُک جائے۔فراق گورکھپوری نے ایک کتاب ''گل نغمہ'' کے عنوان سے لکھی ہے جس میں خزان کے نقشہ کو پیش کیا ہے۔وہ اپنے مناظر میں نقش گری حسین انداز سے انجام دیتے ہیں:

ارباب چمن کو کفن خاک اُڑاتی   بالیدگی ہر ذرّے میں آئی ہے چھپاتی
تو مرگ نباتات ہےتو روح نباتی   یا جان نمو موج فضا بن کے ہے آتی

اے باد خزاں باد خزاں باد خزاں چل
اے باد خزاں باد خزاں باد خزاں چل

پھولے ہوئے گلزار کو ویراں کیا ہے   طاؤس کو اُڑتی ہوئی ناگن نے ڈسا ھے
اک قہر ہے آفت ہے قیامت ہے بلا ہے   یا باغ میں لہرائی ہوئی برق فضا ہے

اے باد خزاں باد خزاں باد خزاں چل
اے باد خزاں باد خزاں باد خزاں چل

(گل نغمہ،صفحہ۳۸۲،۳۸۴)

مذکورہ کے اشعار میں فراق نے باد خزاں،نمو موج،فضا،چمن،نباتات،ذرہ ناگن،طاؤس،گلزار اور

برق جیسے الفاظ استعمال کر کے ہمارے ذہن کو زیادہ متاثر کیا ہے اور بادخزاں کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔ فراق کہتے ہیں کہ بادخزاں میں جو پھول کھلے ہیں غنچوں اور پتوں کو برباد کرتے ہیں۔اس کو بربادی کرنے کا جو راز ہے وہ پوشیدہ ہے ۔فراق گھورکھپوری نے اس چھپے ہوئے راز کو اپنی شاعری کے اشعاروں میں پیش کیا ہے یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی اہمیت ہیں۔

اردو شاعری میں نئے رجحانات اور نئے تجربوں کا چلن رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اُردو شعرا مختلف موضوعات اور عنوان پر قلم اُٹھائے رہتے ہیں وہاں منظر نگاری کا جو عنصر ہے کہیں نہ کہیں صورت میں دکھائی دیتا ہے۔اردو شاعری کے میدان میں دور جدید کے شاعر وزیر آغا نے اپنی شاعری میں فطرت کے مختلف اشیاء سے یوں منظر نگاری سے رشتہ جوڑا ہے۔

آیا وہ تیرے پاس جو خود سے جدا ہو — چہرہ سا اک لگا کے تیرا ہم نوا ہوا
وہ برگ سبز جس کو اُڑا لے گیا تھا تو — ڈھونڈا تو مل گیا مجھے بن میں پڑا ہوا
شبنم سے اپنی پلکوں کو اتنا بھگو کہ میں — سوچوں کہ ایک سوکھا شجر بھر ہرا ہوا
اوپر مجھے ستاروں کی لکھیر ہوئی تھی راکھ — نیچے گھنے درختوں کا جنگل جدا ہوا
آواز کے بھنور میں مجھے مت گھرا کہ میں — کرنوں کا جال توڑ کے کل ہی رہا ہوا

کرنا پڑے گا اپنے سائے میں اب قیام
چاروں طرف ہے دھوپ کا صحرا بچھا ہوا

(غزلیں،صفحہ ۲۳۶،۲۳۷)

وزیر آغا نے بھی اردو غزلوں میں اپنا سر اُونچا کیا ہے انھوں نے مناظر کو ہی بنیاد بنا کر اپنے شعری

تجربوں میں اپنا راستہ ہموار کیا ہے۔وہ اپنے اشعار میں پھولوں ، پرندوں، درختوں اور بادلوں کا تذکرہ خوبصورت لفظوں میں کرتے ہیں۔اس طرح ہمارے سامنے منظر نگاری کا ایک شاندار نقشہ پیش ہوتا ہے۔

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا　　رات بھر نافہ گل بن کے مہکنے والا

بلکہ ابر تھا بس دیکھنے آیا تھا مجھے　　کوئی بادل تو نہیں تھا وہ چھلکنے والا

راکھ میں،آنکھ میں، پھول پہ،کیسلی شب میں　　بے ضرروت بھی تو چمکا ہے چمکنے والا

کس کی آوازیں ہے توٹتے پتوں کی صدا　　کون اس رت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

چاند ہر روز بدلتے ہو تمہارا کیا ہے

میں سمندر ہوں ابد تک نہ بہکنے والا

(غزلیں،صفحہ۵۲،۵۳،)

دور جدید کے شعرا میں ناصر کاظمی کا نام بھی اہم ہے۔ان کی شاعری پر نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں جذبات کی مصوری اور احساسات کی نقش گری کی ہے۔اس فن کو ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں شامل کیا ہے۔اگر ان کی شاعری میں منظر نگاری بہت کم بھی ہے۔پھر بھی ان کا ہر ایک شعر منظر نگاری کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔یوں تو ناصر کاظمی نے چار شعری مجموعہ لکھے ہیں۔جن مین ایک ''برگ نے'' کے نام سے ہے جس میں اردو غزلیں موجود ہیں۔''برگ نے'' کی تمام غزلوں میں پھول،سبزہ،ابر اور شبنم کے اشعار ملتے ہیں۔ان کو ناصر کاظمی نے منظر نگاری کے عنوان سے ایک الگ گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

دور فلک جب دہراتا ہے موسم گل کی راتوں کا　　کنج قفس میں سن لیتے ہیں بھولی بسری باتوں کو

ریگ رواں کی نرم پتوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا　　　　سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو

مے خانے کا افسردہ ماحول تو یوں ہی رہتا ہے　　　　خشک لبوں کی خیر مناؤ کچھ نہ کہو برساتوں کو

ناصر میرے منہ کی باتیں یوں تو سچے موتی ہیں

لیکن ان کی باتیں سن کر بھول گئے سب باتوں کو

(برگ نے، صفحہ ۵۹)

مذکورہ اشعار میں منظر نگاری بھرپور ہے یہ سب اشعار اردو شاعری میں ایک نئے پہلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جہاں پر دل و دماغ زیادہ متاثر ہوا وہاں پر منظریہ اشعار لکھ ڈالے ہیں۔

جنت ماہی گیروں کی　　　　ٹھنڈی رات جزیروں کی

سبز سنہرے کھیتوں پر　　　　پھواریں سرخ لکیروں کی

اس بن سے آئی ہیں　　　　آوازیں ہے زنجیروں کی

کڑوے خواب غریبوں کے　　　　میٹھی نیند ہے امیروں کی

رات گئے تیری یادیں　　　　جیسے بارش ہے تیروں کی

مجھ سے باتیں کرتی ہے　　　　خاموشی ہے تصویروں کی

ان ویرانوں میں ناصر

کان دَبی ہے ہیروں کی

(دیوان ناصر کاظمی صفحہ ۱۲۶)

اردو کے شعرا نے مختلف طریقوں سے رنگ بے رنگی تصویروں کو اپنے اشعار میں برتاؤ ہے۔اور مختلف پھولوں کا بھی ذکر کیا ہے۔کہیں پر محبوب کو پھول سے تشبیہ دی گئی ہے تو کہیں پر پھول کی خوشبو اور کہیں اس کے رنگ پر متفرق اشعار کہے گئے ہیں۔ناصر کاظمی لکھتے ہیں۔

نہتے گاتے روتے پھول جس میں ہیں کیسے کیسے پھول

اور بہت کیا کرنے ہیں کافی ہیں یہ تھوڑے پھول

وقت کی پھلواری میں نہیں دامن میں ہیں ایسے پھول

اس دھرتی کی رونق ہیں میرے کانٹے تیرے پھول

اک ہری کونپل کے لئے میں نے چھوڑے کتنے پھول

اونچے اونچے لمبے پیڑ سارے پیلے پیلے پھول

مٹی کی خشبو لینے نیل گگن سے اترے پھول

گورے گورے ننگے پیر جھلمل جھلمل کرتے ہیں پھول

مہک اٹھی پھر دل کی کتاب یاد آئے یہ کب کے پھول

کانٹے چھوڑ گئی آندھی

لے گئی اچھے اچھے پھول

(دیوان ناصر کاظمی صفحہ ۹۳۔۹۴)

دور جدید میں پروین شاکر نے بھی نے اپنی شاعری میں سادہ اور سہل لہجے میں فکروفن اور اردو شاعری میں منظرنگاری کے عمدہ مثالیں بہترین نمونے کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

شام آئی تری یادوں کے ستارے نکلے　　رنگ ہی غم کے نہیں نقش بھی پیارے نکلے

ایک موہوم تمنا کے سہارے نکلے　　چاند کے ساتھ ہجر کے تارے نکلے

کوئی موسم ہو مگر شان خم و پیچ رہی　　رات کی طرح کوئی زلف سنوارے نکلے

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بہا لایا تھا　　وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں آ گاتا کیسے

شاخ پھوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

(صدر برگ، صفحہ ۳۲،۳۳)

پروین شاکر نے مذکورہ اشعار میں ستارے، چاند تارے، زلف سنوارے اور رُت جیسے لفظوں کو استعمال کر کے منظر نگاری کی اچھی مثال دی ہے۔ وہ اپنے سماج کی بگڑی ہوئی حالت سے مایوس نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقبل اور انقلاب کی خواہش مند ہے۔

احمد فراز نے اپنی شاعری میں بھرپور فطرت کی عکاسی کی ہے مگر جہاں تک منظر نگاری کی شاعری تعلق ہے۔ یہ شاعر بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں زندگی کی تلخ گوئی کی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ جہاں تک اردو شاعری میں منظر نگاری کا سوال ہے وہ اپنی شاعری میں مناظر کو اُداس لفظوں میں جامعہ پہنا کر بیان کرتے ہیں۔

ابر بہار اب کے بھی برسا پرے پرے　　گلشن اجاڑ ا اجاڑا ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی　　جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

رہتے ہیں اہل شہر کے سائے سے دور دور　　ہم آہو اِن دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گل بن کے پھوٹتا ہے لہوشا خسار سے　　زخم رگِ بہار میں پتے ہرے ہرے

زندہ دلان شہر کا کیا ہوگیا فراز

آنکھیں بجھی بجھی ہیں چہرے مرے مرے

(جانِ جاناں،صفحہ۳۶،۳۵)

اس تمام بحث کے بعد آخر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں اردو شاعری کا اپنا مرکز سرزمین ہندوستان دکن رہا ہے۔ جہاں سے اردو شاعری کو ترقی ہوئی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں اردو شاعری میں زیادہ تر انسانی حسن کو فطرت کے حسن سے برتر قرار دیا گیا جس کی ذکر ہم نے پہلے سے کی ہے۔ دراصل یہ رجحان دور ابتداء سے لے کر دور جدید تک قائم رہا ہے اردو شاعری میں منظر نگاری اور فطرت نگاری کو برار تصور کیا گیا ہیں،اور یہ رجحان اردو شاعری میں عام ہیں مگر دور جدید میں نئے شعرا کے اثرات سے فطرت پرستی کا رجحان زیادہ شدید ہوگیا۔اس لئے دور جدید سے بہت سے شعرا نے منظر نگاری میں زیادہ تر کامیابی حاصل کی ہے۔

باب تیسرا:

اردو نظم کا آغاز وارتقاء

(۱) اردو نظم کے محرکات

(۲) ابتدائی نظم گو شعرا

اردو نظم کا آغاز وارتقاء

اردو شاعری میں غزل کا سرمایہ نہایت شاندار اور قابل قدر ہے۔لیکن نظم کی پونجی بھی کچھ کم نہیں جس دن اردو شاعری نے آنکھ کھولی ہے اسی دن اردو نظم نے بھی جنم لیا ہے۔اس دن سے لے کر آج تک اردو نظم نگاری کا یہ سفر جاری وساری ہے عہد حاضر کی نظم میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن میں کسی ترقی یافتہ زبان سے توقع کی جاسکتی ہے۔

نظم کی تعریف

نظم اس صنف کو کہتے ہیں جس میں ایک عنوان کے تحت کسی بھی خیال واقعہ،قصہ یا تجربہ کو ربطہ وتسلسل کے ساتھ شعری تقاضوں کے مطابق بیان کیا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ نظم سے مراد شاعری کی وہ صنف ہے جس میں کسی ایک موضوع پر ربطہ وتسلسل کے ساتھ مختلف اظہار خیال کیا گیا ہو۔عام طور پر نظم کا موضوع بھی ایک واقعہ پر ہوتا ہے۔نظم کے لغوی معنی ''موتی پرونے کے ہیں۔اردو میں جو نظم پہلی موجود تھی اس میں غزل کی طرح ردیف،قافیہ،بحرااور وزن کا خیال رکھا جاتا ہے آج کے دور میں ردیف اور قافیہ کم ہی پایا جاتا ہے۔اس میں بھی غزل کی طرح بحر وقافیے کی پابندی لازم تھی۔اب نظم کے موضوعات بھی لامحدود د ہیں۔اس طرح اس کی شکلیں بھی بے شمار ہیں۔یعنی اردو نظم نگاری میں مثلث،مربع،مسدس،مخمس،مثمن،ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ اس کے مختلف روپ ہے۔

ہیت کی قسمیں

ہیت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہیں ۔نظم کی جو پہلی شکل وجود میں آ گئی ہے ایسی نظم کو پابند نظم کہا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں جہاں تک پابند نظموں کا تعلق ہے۔اس میں ردیف اور قافیہ کے علاوہ بحر کے کچھ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔اس نظم میں موضوعات کی کوئی بھی قید نہیں پابند نظم میں کسی بھی موضوعات پر اشعار بیان کر سکتے ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر شاہ فیصل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ’’ پابند نظم نئے انداز کی ایسی جن کے بندوں کی ساخت مروجہ ہیتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصروعوں میں قافیوں کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہولیکن ان تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا کوئی نہ کوئی التزام ضرور پایا جائے پابند نظمیں کہلاتی ہے۔‘‘
>
> (ایم۔اے۔ایل اردو صفحہ ۱۳۵‘)

اردو شاعری کا آدھا حصہ پابند نظموں پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں ابتداء سے لے کر آج تک تمام شاعروں نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اس طرح سے نظم کے فروغ دینے میں شاعر کا اول رول رہا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک پابند نظم لکھی ہے جوش نے یہ نظم ’’ گاتی ہوئی راتیں‘‘ کے عنوان سے لکھی ہے اس نظم کے اشعار ملاحظہ ہو۔

چھاؤں میں تاروں کہ ملی ہیں تجھے گاتی ہو　　　راہیں کھیتوں کے کنارے پیچ وخم کھاتی ہوئی

کوہ صحرا کو سناتی ہیں حدیث ورنگ وبُو　　　پتلی پتلی ٹہنیوں پر قمریاں گاتی ہوئی

اُداس میں ڈوبی ہوئی چلی ہے متواں ہوا　　　کنج میں چھپتی ہوئی غنچوں کو چٹکائی ہوئی

پھوٹی ہے عشوہ ترکانہ سے پہلی کرن نبض خارخس میں خون گرم دوڑاتی ہوئی

چرخ سے آتی ہے رہ رہ کر صدا روشن نگاہ خواں سے اُٹھتی ہے کلیاں ناز فرمائی ہوئی

پھوٹتی ہے کرن جیسے کوئی کمسن عروس

آرہی ہو کھیلتی گنگن سے شرماتی ہوئی

(گاتی ہوئی راتیں، صفحہ ۱۸۷)

اردو شاعری میں دوسری ہیت نظم معریٰ کے نام سے ہے۔ یہ ہیت بھی انگریزی اثر سے اردو میں داخل ہوئی ہے۔اس کو انگریزی میں بلیک ورس کہتے ہیں۔اس بارے میں الطاف حسین حالی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''شروع شروع میں اس کو ''نظم مقفیٰ'' بھی کہا گیا تھا''

(مقدمہ شعروشاعری، صفحہ ۱۶۷)

معرا نظم

اس کو نظم معریٰ صیح اور درست نام ہے۔یہ انگریزی بلینک ورس (blank verse) کا ٹھیک لغوی ترجمہ ہے۔یہ نام اس کو اردو میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دیا ہے۔عبدالحق کے ساتھ اکبرآبادی نے بھی اس ہیت کو نظم معریٰ ہی تسلیم کیا ہے۔نظم معریٰ کی عمر بھی سو سال سے کم ہے۔اس سے پہلے اس کی کوئی روایت نہ تھی۔اردو نے ہمیشہ عربی اور فارسی زبانوں کی خدمت کی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل فارسی اور عربی شاعری کی مورث ہیں اِن دونون زبانوں میں نظم معریٰ کی روایت ثابت نہیں ہوئی ہے۔مشرق کی جتنی بھی زبانیں ہیں یہ زبان زمانے قدیم سے مقفیٰ شاعری کی دلدادہ رہی ہیں۔اس

ہیت میں لکھنے والے بہت سے شعرا سامنے آئے ہیں جن میں اختر الایمان، جان نثار اختر ،اکبر الہ آبادی اسمعیل میرٹھی اور فیض احمد فیض وغیرہ شامل ہے۔فیض احمد فیض نے ایک نظم اسی ہیت میں کہی ہے۔اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہراک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(تنہائی،صفحہ۱۴۷)

آزاد نظم

اردو شاعری کی تیسری ہیت'' آزاد نظم'' کے نام سے وجود میں آئی ہے۔جس کو ہم انگریزی میں فری ورس(free vesrse) کے نام سے جانتے ہیں۔بیسوی صدی میں اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اسی صدی میں انگریزی شعرا نے اس صنف میں نام کمایا ہے۔جن میں بادلیر،ایلیٹ اور لارنس

وغیرہ کا نام اہم ہے۔ اردو شاعری نے آزاد نظم میں عروضی آہنگ کا لحاظ رکھا ہے۔ آزاد نظم سب سے زیادہ مقبول درجہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ روایتی اصناف اور مقفیٰ شاعری کا رواج بہترین زوال کی طرف گامزن ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں آزاد نظم فرانسی اور انگریزی ادب کی تقلید سے وجود میں آئی ہے۔ آزاد نظموں میں عروضی وزن نہیں ہوتا ہے بلکہ اِن میں آہنگ ہوتا ہے۔ جس کو ہم ناپاک نہیں کہہ سکتے ہیں بلکہ ان کو محسوس کیا جاتا ہے۔ آزاد نظم میں مصرعے کی ترتیب چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن بیچ میں قافیہ کا استعمال کرتے ہیں جس میں کسی حد تک حُسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

نثری نظم

جس نظم میں شعر کے خواص کے ساتھ ساتھ داخلی آہنگ بھی پایا جائے اس کو ہم نثری نظم کہتے ہیں۔ نثری نظم روایتی ردیف قافیہ، وزن اور بحر سے آزاد ہوتی ہے۔ نثری نظم کا اپنا ایک اندرونی آہنگ ہوتا ہے۔ جو اپنی اس لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نثری نظم لکھنے والے شعرا کی تعداد کافی ہے۔ جیسے سجاد ظہیر، خورشید اسلام بلراج کومل، شہاب جعفری، خلیل مامون، شہر یار اور ساجد زہدی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اردو نظم کے محرکات

اردو نظم کی تاریخ وہی ہے جو اردو شاعری کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نئے حالات کے اقتضاد، سرسید کی تحریک، کرنل ہالرائیڈ کی تائید اور خود اپنی افتادِ طبع کی ترتیب سے مولا محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کی سنگ بنیاد رکھا ہے۔ جو انجمن پنجاب کے زیر اہتمام اگست ۱۸۶۷ء میں ہوا ہے۔ جس میں محمد حسین

آزاد نے ''خیالات نظم اور کلام موزوں کے باب میں زیر عنوان اپنا خطبہ پیش کیا۔اس انجمن میں آزاد نے ایک مثنوی 'شب قدر'' کے عنوان سے لکھی ہے جس سے جدید نظم نگاری کی بنیاد پڑی ہے۔حالی اور آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کی بھی بنیاد رکھ کر اردو نظم کو ایک تحریک کی شکل دی ہے اور اس تحریک سے اردو نظم انسانی زندگی کے معاملات ومسائل کا مظہر بن گئی ۔مولانا اسماعیل میرٹھی نے آزاد سے الگ رہ کر ۱۸۶۷ء میں نئے انداز کی چند نظمیں لکھیں اور بعد میں وہ برابر اس قسم کی نظمیں لکھتے رہیں۔شبلی نے اپنی نظموں میں مسجد کانپور کی شہادت کے المیہ اور ترکوں پر توڑنے جانے والے مظالم کو اپنا موضوع بنا کر اردو نظم کی نئی سمت دی ہے۔اکبر الہ آبادی نے اپنی طنز آمیز شاعری سے مغربی تہذیب پر نشتر چلائے ۔اکبر کے دور میں اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے اور اپنی نظموں کے ذریعہ اردو شاعری کے وزن اور وقار عطا کیا ہے ۔ جوش ملیح آبادی نے انقلابی نظموں سے اردو شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔اس بارے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''آزاد اور حالی کے علاوہ ڈاکٹر نذیر احمد مولانا ذکاءاللہ اور بعض دوسرے علماء بھی نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے کیونکہ انھیں اس صنف کی افادیت کا احساس تھا اس عہد میں اسماعیل میرٹھی ،مولانا شبلی ،اکبر الہ آبادی سرور جہاں آبادی نادر کا کوروی اور پھر کچھ دور ہٹ کر پنڈت کیفی، چکبست ، اقبال،شوق ،صفی اور ظفر علی خاں وغیرہ نظم گوئی کا علم کچھ اس طرح بلند کیا کہ زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلو شاعری میں جگہ پاتے چلے گئے۔''
>
> (جدید شاعری صفحہ ۵۲)

انجمن پنجاب میں نظم نگاری

محمد حسین آزاد نے جدید نظم نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔انھوں نے انجمن پنجاب کے نام سے علمی اور ادبی سوسائٹی قائم کیا ہے ۔اس سے اردو نظم نگاری کو فروغ ہوا ہے۔۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں آزاد نے ایک مضمون پیش کیا ہے جس میں انہوں نے جدید نظریہ کی روایت کو قائم رکھا ہے۔محمد حسین آزاد کے اس لیکچر کو جدید اردو نظم کا سنگ بنیاد سمجھا گیا۔انہوں نے جدید شاعری کے لئے کچھ خاص مشورے پیش کئے ہیں آزاد نے اپنی شاعری میں یہ کہا ہے کہ ہمارے ہندوستانی شاعروں کو انگریزی شاعری سے فیض یاب ہونا چاہیے ۔۱۸۷۴ء میں انھوں نے انجمن پنجاب کے جلسے میں اپنی طویل تقریر میں یہ کہا ہے۔

> ''اب زمانہ کچھ اور ہے ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہوا ہے ۔جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستہ ہر طرف لئے کھڑی ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ۔''
>
> (نیرنگ خیال، صفحہ ۱۰۴)

دراصل محمد حسین آزاد روایتی اور مروجہ شاعری کو غزل کے دلفریب جال سے نکالنا چاہتے تھے جس سے اپنے عہد کی اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی شعوری عکاسی کر سکے۔اس نے صرف اپنا رجحان ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس کی حمایت میں ایک عملی طور پر حصہ بھی لیا ہے اور آنے والے نظموں کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔آزاد نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں اور دوسروں کو بھی نظم نگاری لکھنے کی تلقین کی ہے۔اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ جدید تحریک اور نئی نظمیں آنے والی نسلوں کے لئے

مشغل راہ بن گئی۔اس تاریخی اعتبار سے آزاد کی نظمیں اردو شاعری کی تحریک میں ایک اہم حیثیت کی حامل ہیں۔

محمد حسین آزاد کے شعری مجموعے میں نظم دل افروز اور مجموعہ نظم آزاد ہیں۔اس میں شامل ''شب قدر''''مثنوی خواب وامن''''صبح امید''''گنج قناعت''''دادانصاف اور وداع انصاف وغیرہ ان کی قابل قدر نظمیں ہیں آزاد نے اپنی نظموں میں تشبیہ اور استعارہ استعمال کئے ہیں۔وہ اِن نظموں میں تمثیلی انداز اختیار کرتے ہیں۔اِن کی شاعری کی یہ خوبیاں پہلے سے موجود ہیں اور نظم تو اس کے لیے نہایت موزوں جگہ ہے۔

ہے سامنے کھلا ہوا میدان چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کھڑی کہہ رہی ہے ہاں چلے چلو

(نظم دل افروز،صفحہ۸۹)

محمد حسین آزاد نے نظم نگاری کے ذریعہ سے نئے طریقہ اظہار کی تلاش کی ہے۔انھوں نے تشبیہ وترصیع کے بجائے تمثیل نگاری ،منظرکشی اور تسلسل زبان سے نظم کا نیا شعری پیکر بنایا۔انھوں نے ۱۸۷۴ء کے مشاعرہ میں اپنی نظم ''شب قدر'' پڑھ کر سنائی تھی اوراس کا ذکران کے ایک عزیز شاگرد ممتازعلی نے مجموعہ نظم دل افراز اورنظم آزاد میں کیا تھا۔

''آزاد کے جوش طبیعت نے جوکوہ آتش خیز کی طرح مدت سے رک رہا

تھا مئی ۱۸۷۴ء میں رسمی بندشوں کو جھٹکے مار کر توڑ ڈالا اور انہوں نے بزم شعرا میں ایک نئے ڈھنگ کی مثنوی، جس کا نام شب قدر تھا، سنائی۔ سننے والے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت وہ مثنوی مجلس شعرا میں پڑھی گئی، تمام مجلس پر ایک سناٹا اور سکوت کا عالم چھا گیا۔ یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کینئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔''

(نظم دل افروز، صفحہ ۱۳۴)

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی ادب نے اُردو شاعری کو متاثر کیا ہے انگریزی شاعری کے نمایاں خوبی نظم نگاری ہے۔ جہاں ایک خیال آخر تک رکھا جاتا ہے اس میں کوئی فکر پہلو اور عنوان بھی ہوتا ہے۔ اردو میں ایسی نظمیں موجود تھیں لیکن وہ پابند نظمیں تھیں ۱۸۵۷ء کے بعد اعتقادات کے ٹوٹنے سے بے سمتی نے جنم لیا انسانی زندگی نے بے توقیری فرد کو لامرکزیت کا شکار بنا دیا ہے جس نے ادبی منظّم تحریک کو مختلف رجحانات کو فروغ دیا ہے۔ جدید اردو نظم مغربی اثرات کے باعث وجود میں آئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے اس کا جائزہ مختلف تحریکوں میں لیا جائے۔

بیسویں صدی میں نظم نگاری کو ایک الگ صنف کے طور پر فروغ حاصل ہوا آزاد کے بعد مولانا الطاف حسین حالی کی کوششوں سے جدید نظم نگاری وجود میں آئی ہے۔ اس دور میں حالی نے ''مسدس'' حالی لکھ کر نظم نگاری کو مقصدیت کی طرف گامزن کیا ہے۔ آزاد اور حالی نے انگریز افسر کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اس دور سے نظم نگاری کا آغاز ہوا انجمن پنجاب کے مشاعروں میں اکثر شعرا نے مصرعہ کے بجائے مختلف موضوعات پر توجہ دیا ہے۔ اس مشاعرے میں حالی نے بھی نظمیں کہیں

تھے۔جن میں ''مناجات بیوہ'' چپ کی داد'' ''حب وطن'' وغیرہ شامل ہے۔اور یہی سے انجمن پنجاب کے قیام سے نظم نگاری کا راستہ ہموار ہوگیا تھا۔اس انجمن پر چلنے والے بہت سے شعرا سامنے آئے ہیں۔جن میں الطاف حسین حالی کا نام بھی اہم ہے۔آپ کے یہاں غزل کی نسبت نظمیں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں ایک انقلاب آیا اور نظم ونثر دونوں کو انسانی زندگی کے قریب آنے کا موقع ملا تو حالی جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے تھے۔حالی نے جدید نظم نگاری کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور ساتھ ہی اس سے اس قدر مقبول بنا دیا ہے کہ علامہ اقبال جیسا شاعر پیدا ہوا جس نے اپنی جدید نظم کے ذریعہ اردو شاعری کو ایک نیا رنگ بخشا کہ یہ صنف مقبول ہوگئی۔مولانا الطاف حسین حالی نیچرل شاعری کے علمبردار تھے۔اردو نظم نگاری کو مقبول خاص وعام بنانے کی جیسی منظّم کوشش حالی نے کی ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نے پابند نظمیں لکھیں ہیں۔انھوں نے انجمن پنجاب میں جو نظمیں کہیں ہیں اُن نظموں میں حب الوطنی کے جذبات صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔اِن کا خیال تھا دیگر اسباب کے علاوہ غزل وقصیدہ مسلمانوں کی بربادی کے خاص طور پر ذمہ دار ہیں۔انھوں نے مقدمہ شعروشاعری میں غزل وقصیدہ پر شدید اعتراضات کئے ہیں۔حالی کو یقین تھا کہ اُردو نظم نگاری میں تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی باتیں کہی جائیں گی تو ہر ایک کا دل آسانی کے ساتھ موڑ سکے گا۔

جدید شاعری کی اولین تحریک انجمن پنجاب کے زیر اہتمام سب سے پہلے لاہور میں شروع ہوئی ہے جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جس کے علمبردار حالی اور آزاد تھے۔قیام لاہور کے دوران حالی کو اصل فائدہ یہ ہوا کہ حالی کو مولانا آزاد سے تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے۔اس انجمن میں مولانا الطاف حسین

حالی اردو شاعری کو حقیقت اور واقعیت سے قریب لانا چاہتے تھے۔حالی کی طبعیت میں سادہ مزاجی ہے ایک طرح آزاد سے دوستی اور محبت دوسری طرح سر سید سے بہت عقیدت تھی۔اِن نظموں کو لکھ کر انھوں نے آزاد کی تحریک میں عملی حصہ لیا ہے۔انھوں نے نثر و نظم دونوں استعمال کئے ۔نہ صرف آزاد سے مل کر یہ نظمیں لکھیں ہیں بلکہ سرسید تحریک کے خاطر اِن کی مشہور نظمیں ہے۔جن میں ''مسدس مدوجزر اسلام'' بھی ہے۔اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی ثقافتی وسیاسی داستان کو بیان کیا ہے۔

ہماری ہر ایک بات میں سلفہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آباء کو ہم سے گہن ہے ہمارا قدم ننگِ اہل چلن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

(مسدس حالی،صفحہ ۱۴۵)

مدوجزر اسلام کے علاوہ ''مناجات بیوہ'' اور چپ کی داد حالی کی مشہور نظمیں ہیں۔حالی نے اپنی نظموں میں سماج کے مخصوص طبقہ کے اہم مسائل پر خاص توجہ مبذول کیا ہے اور اس میں عورتوں کی مظلومیت ذہنی پسماندگی کے اسباب اور سماجی حیثیت کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔مثلاً مناجات بیوہ،چُپ کی داد غیرہ۔مناجات بیوہ میں لکھتے ہیں۔

تم ہو تو غربت ہے وطن تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کے تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے

(مناجات بیوہ، صفحہ ٦٧)

حالی نے برسات کے موسم کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کھینچ کر مناظر کی ترجمانی کی ہے۔ان کی جزئیات نگاری فطرت سے قریب کرتی ہے۔اس میں حالی مقامی فضا اور ہندوستانی ماحول کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔حالی نے ایک نظم ''حب وطن کے عنوان سے لکھی تھی جس میں حالی نے وطن کی محبت کے تقاضوں کو بیان کیا ہے۔

تو ہی کرتا ہے سب پہ جان نثار　　　یا کہ دنیا ہے تیری عاشق راز

کیا زمانے کی تو قیر عزیز نہیں　　　اس سے وطن تو ،تو ایسی چیز نہیں

(حب وطن، صفحہ ٧٨)

حالی نے اپنی نظموں میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت سادہ اور سہل ہے۔اس لئے الگ الگ اشعار پر نظر نہیں ٹھرتی اور پڑھنے ولا بنا کسی رکاوٹ کے ساتھ اِن کی نظمیں پڑھتا ہے۔حالی کی نظمیں سب سے زیادہ موزوں ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں عوام کی زبان اختیار کی ہے۔حالی نے ایک ایسے نازک موڑ پر ہماری تہذیب، ہماری زبان اور ہمارے ادب سخت آزمائش سے دو چارہ تھے۔ ہماری مردہ شاعری میں جان ڈال دی ہے حالی جدید شاعری کے پیامبر بن کر سامنے آئے ہیں۔جب الطاف حسین حالی کی نظموں سے آزاد کی نظموں کا مقابلہ کیا جائے تو آزاد کی کئی نظموں میں شعریت اور عنائی کم نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی کی نظمیں انجمن پنجاب کے مقابلے میں برار ہے۔

دور جدید میں نظم نگاری

اسماعیل میرٹھی نے دور جدید میں اردو نظم نگاری کی تحریک میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے اردو میں بچوں کے لئے نظمیں کہیں ہیں۔اردو ادب کا اضافہ کرنے کے لئے اسماعیل میرٹھی نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔اِن کے طویل نظموں میں سرسید کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ جب آزاد اور حالی نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی تو اسماعیل نے اپنا راستہ الگ اختیار کیا ہے۔اس دور میں اِن کا نام بھی ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔اسماعیل نے آزاد سے الگ رہ کر غالباً اسی تحریک سے متاثر ہوکر ۱۸۶۷ء ہی میں نئے انداز کی چند نظمیں لکھیں اور بعد میں برابر اس قسم کی نظمیں لکھتے رہے۔حالی اور آزاد نے تو نظم کے ذریعے بھی اس کی تبلیغ کی مگر اسماعیل خاموشی کے ساتھ شاعری کرتے رہے۔حالانکہ اِن تینوں بزرگوں کا جو بنیادی مقصد تھا وہ اردو شاعری کی اصلاح اور اس کی موضوعاتی وسعت تھا اسماعیل میرٹھی نے ایک نظم ''برسات'' کے عنوان سے لکھی ہے۔

کالی گھٹا برسات کی آئی　　ٹھنڈی ہوا برسات کی آئی

پڑتی ہیں تھم تھم تھم تھم بوندیں　　جھم جھم بوندیں چھم چھم بوندیں

گل گل مہکے بلبل چہکے　　لالہ لہکے جنگل دھکے

کائل کوکے مور پکارے　　کبک دری سن قہقہہ مارے

جھومے گھٹا کا کنجل ہاتھی　　سونڈ کو لپٹے نشو نباتی

رعد لگا کے سڑ سڑ کوڑے　　آتش بازی بجلی چھوڑے

نہر کا جو بن نکھرا نکھرا　　سبزے کا عالم بکھرا بکھرا

کالی کالی بدلی لپکے اس کے بدلے مستی ٹپکے

(برسات،صفحہ۷۶،۷۷)

ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں۔

پڑتی ہیں بوندیں جھل مِل جھل مِل ہنستی ہیں کلیاں کھل کھل کھل

پھیلتی ہیں لہراتی ہیں بیلیں اینڈتی ہیں مِل کھاتی ہیں بیلیں

پھرتی ہیں کرتی ہر پھر چڑیاں اُڑتی ہیں پھر پھر پھر چڑیاں

کیاری کیاری آج ہری ہے باغ نہیں اک سبز پری ہے

دوپ نے نخل اپنا بچھایا نشوونما کی دھوم مچی ہے

برکھارت پر نامیہ جاں دے

اچھلے پھد کے کودے پھاندے

(برسات،صفحہ۷۸،۷۷)

ترقی پسند تحریک میں نظم نگاری

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کو ایک نیا رنگ دیا ہے اس تحریک نے اردو نظم نگاری کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا۔۱۹۳۶ء کے قیام سے کہیں اہم شاعر اس سے وابستہ رہے۔اِن میں جوش ملیح آبادی،فیض احمد فیض،ساحر لدھیانوی،احمد ندیم قاسمی،جاں نثار اختر،مخدوم،کیفی اعظمی،علی سردار جعفری،اختر شیرانی،جذبی،علامہ اقبال،وغیرہ شامل ہیں۔اس تحریک میں شعرا کے الگ الگ خیالات ہیں۔جوش کی نظموں میں ایک نیا انقلاب ہے۔تو دوسری طرح احمد ندیم قاسمی کے ہاں ترقی پسندانہ

نظریات کے ساتھ ساتھ دیہاتی مناظر کی تصویر کشی کو اُجاگر کرنے کی صلاحیت ہے۔ساحر کی شاعری میں انسان کی عظمت اس کی بقاء اور امن عالم کا تصور اس قدر تندرست وتوانا دکھائی دیتا ہے کہ وہ نفرت اور نا آسودگی کو جذبہ عمل میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔انسانی عظمت کے اس احساس کے سبب تقسیم ملک کے بعد نفرت چھا جانے والے بادلوں اور تعصب کے دھندلکوں میں بھی ساحر نے تہذیبی اور ارتقائے انسانی کی شمع جلائے رکھی ہے۔

زندگی سے اُنس ہے حُسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی عشق کا الاؤ ہے
دل ابھی بجھا نہیں

رنگ بھر رہا ہوں میں خاکہ حیات ہے
آج بھی ہوں منہمک فکرِ کائنات میں
غم ابھی لُٹا نہیں

حرف حق عزیز ہے ظلم ناگوار ہے
عہدِ نو سے آج بھی عہدِ استوار ہے
میں ابھی مرا نہیں

(دل ابھی، صفحہ ۶۸)

اس تحریک سے جڑ کر ساحر نے بہت سے نظمیں لکھیں ہیں۔جن میں ساحر کی ایک مشہور نظم ’’تاج محل‘‘ بھی شامل ہے۔اس نے اپنی مشہور نظم تاج محل ایسی نیک ساعت میں لکھی تھی کہ اس نظم نے

اشاعت پذیر ہوتے ہی ملک گیر شہرت کا ''انوکھا ہار'' ساحر کے گلے میں لوادیا۔اس بارے میں جناب شافع قدوئی لکھتے ہیں۔

> ''ساحر لدھیانوی واحد ایسے ترقی پسند شاعر ہیں،جنھیں فیض کی استثنائی مثال سے قطع نظر،دورانِ زندگی ہی عوام اور خاص ہر دو سطح پر ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔''

(ماہنہ آجکل صفحہ ۱۷)

ترقی پسند تحریک سے جڑ کر ساحر کی غیر مقبولیت اور شہرت کے راز کا پتہ چلا ہے مثلاً ''چکلے''،''کبھی کبھی''،''خوبصورت موڑ''،''پرچھایاں''اور تاج محل کی پسندیدگی میں مضمر نہیں بلکہ بحثیت مجموعی اُن کے شعری اکتسابات کو بھی لائق تحسین کیا گیا ہے۔اِن کی شہرت کا نقش اول اُن کی شہرآفاق نظم ''تاج محل'' ہے۔اِن کی یہ نظم غیر متوقع ردِ عمل کی اچھی مثال ہے کہ شاعر نے اس لازوال تہذیبی کو استحصال اور شاہی استبداد کی ایک جیتی جاگتی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔تاج محل کے موضوع پر بہت سے شعرا نے اپنی جولائی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔اُن شاعروں میں جگن ناتھ آزاد،سکندر علی واجد،سلام مچھلی،احسان دانش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ساحر اپنی نظم ''تاج محل'' میں لکھتے ہیں:

تاج تیرے لیے اک مظہرِ اُلفت ہی سہی — تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور مِلا کر مجھ سے — بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سکوت شاہی کے نشاں — اُس پہ اُلفت بھری رُوحوں کا سفر کیا معنی
میری محبوب پسِ پردہ تشہیر وفا — تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا

مُردہ شاہوں کے مقابر سے بتلانے والی اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان اگنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے

لیکن اُن کے لیے تشہیر کا سامان نہیں کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے

یہ عمارات ومقابر یہ فصلیں یہ حصار مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں

سینۂ دہر کے ناسُور ہیں کہنہ ناسُور جذب ہے ان میں تیرے اور میرے اجداد کا خوں

میری محبوب انھیں بھی تو محبت ہوگی جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل

اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام ونمود آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

(نظم تاج محل، صفحہ ۲۷، ۲۸)

ساحر بنیادی طور پر امن انسانی عظمت کے حامی و پاسدار ہے۔ ساحر نے اپنی نظموں میں احتجاجی اور انقلابی زاویہ نظر اختیار کیا ہے۔ ساحر نے کہیں لاجواب نظموں کا انتخاب کیا ہے جن میں ایک نظم ''خون پھر خون'' ہے اس نظم میں ساحر نے نہ صرف مذہب اور رنگ ونسل کے نام پر استحصال کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا ہے بلکہ جمہوری اقدار کی پامالی اور اجتماعی حقوق سے بے اعتنائی کے خلاف شدید ردعمل ہے:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں　　خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب　　لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ
ظلم کی قسمت ناکارہ و رسو اسے کہو　　جبر کی حکمتِ پرکار کے ایما سے کہو
محمل مجلس اقوام کی لیلیٰ سے کہو　　خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلہ تند ہے خرمن پہ لپک سکتا ہے　　تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کاچہ و بازار میں آنکلا ہے　　کہیں شعلہ، کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر

خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

(نظم خون پھر خون ہے' صفحہ ۲۷)

ایک طرح ساحر کی نظموں میں حق وانصاف ہے تو دوسری طرح ساحر کی شاعری میں مرد اور عورت کا بنیادی فرق موجود ہے مگر جنسی تلذز، اور فحاشی عریانیت کا ذکر نہیں ہے۔ ترقی پسند سے جڑ کر ساحر نے اپنی نظموں میں مظلوم عورت کو جگہ دی ہے۔ ساحر کا کہنا ہے کہ مذہب، اخلاق اور تہذیب ومعاشرت کے نام پر عورت کا دوطرفہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ساحر اس استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں دو پرچھائیاں، گریز، سرزمینِ یاس، نور جہاں کا مزار وغیرہ عورتوں پر ہونے والے مظالم اور استحصال کے خلاف پرتاثیر اور احتجاجی اظہار کو بیان کیا ہیں:

وہ گاؤں کی ہم جولیاں　　مفلوک دہقاں زادیاں
جودست فرط یاس سے　　اور یورش افلاس سے

عصمت لٹا کے رہ گئیں خود کو گنوا کر رہ گئیں

غمگین جوانی بن گئیں رسوا کہانی بن گئیں

کتنی حزیں ہے زندگی

اندوہ گیں ہے زندگی

(سرزمین یاس' صفحہ،۴۰)

ساحر لدھیانوی کی نظموں میں اخلاقی پسماندگی ،طبقائی، استحصال اور حرس و ہوس پر طنز کی کاٹ اور عورتوں کی کم مائیگی اِن کی ذلت اور رسوائی کا غم انگیز احساس نمایاں ہے۔ساحر نے ایک نظم '' چکلے'' کے عنوان سے لکھی ہے جس میں تہذیب کے ٹھیکیداروں پر جو طنز ہے وہ ایک مثال ہے:

یہ بھوکی نگاہیں حسینو کی جانب

یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب

لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب

ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی

یشودا کی ہم جنس ، رادھا کی بیٹی

پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی

ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

(چکلے، صفحہ ۸۲)

مختصراً ساحرلدھیانوی کی نظموں میں عوام کے لئے یہی پیغام ہے کہ شاعری نہ صرف مسائل حیات کی پیچیدگیوں اور اجتماعی زندگی کی نا آسودگی کی ترجمان ہے بلکہ اِن کے بنیادی طریقہ کار اشتراک حقیقت نگاری کی پہچان بھی ہے اور ساتھ ہی ان حقائق کا اظہار ہے جو سرمایہ ومحنت کش اور مفلوک الحال عوام کے آلام ومصائب اور نسلی وطبقائی ترقی پسند تحریک کے بعد تقسیم کے تضاد کی شکل میں نمایاں ہیں۔

اِن کی نظموں میں عوام کے بنیادی مسائل کے حل کے لئے سماجی انقلاب کا جو رجحان ملتا ہے وہ نہ صرف اِن کے نظموں کے رجائی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے بلکہ خدمت خلق کا نمائندہ بھی ہے۔ اِن کی نظموں میں محبت امن اور انسان دوستی کے محور پر مرکوز نظر آتی ہے۔ ساحر نے اپنی نظموں سے عام انسانوں کے دکھ درد کی تفسیر بیان کرنے کا کام لیا ہے۔ان کے ہاں محنت کشوں، کسانوں ،مزدوروں،مظلوموں اور مقہوروں کے جذبات واحساسات کی تصویر کشی ملتی ہے۔

فیض احمد فیض کا بھی شمار ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں ممتاز مقام حاصل کیا۔اقبال کی طرح فیض بھی ایک پیامی شاعر اور ترقی پسند کے امیر کارواں تھے۔فیض احمد فیض کی نظموں میں منظر کشی ،حسن اور احساس کی شدت ہمارے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔فیض نے اردو شاعری کو نئے الفاظ دیئے ہیں انھوں نے اردو نظم نگاری کو معنوی وقار اور ظاہری حسن دیا اور نظم کو اس سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظموں کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔اس طرح نظم نگاری کی تحریک زور پکڑتی گئی۔اردو شاعری کی بساط پر فیض نے جیتے جی اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے اس بارے میں فضیل جعفری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''فیض کی شاعری کی زبان ان تمام ہم عصروں کی شاعری کی زبان سے
الگ تھلگ نظر آتی ہے۔فیض کی نظموں کا مطالعہ ہمیں بلیک سر کے قول کی
یاد دلاتا ہے کہ اچھے شعراء پہلے سے موجود زبان کو اس طرح استعمال
کرتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی تخلیق معلوم ہو۔''

(چٹان اور پانی،صفحہ ۲۷)

فیض نے اپنی ایک نظم ''تنہائی'' کے عنوان سے لکھی ہے۔اس نظم میں سوگواری اور اداسی کی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔اس نظم کے چند اشعار بھی دیکھئے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(نقش فریادی،صفحہ ۱۹۳)

اس نظم کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''پوری نظم کا ڈِکشن رومانیت اور غمِ جاناں سے مربوط ہے۔فیض کا احساس تنہائی اِس نظم میں افسردگی کا بھی حامل ہے یعنی کچھ تشویش اور ڈپریشن کا بھی عمل دخل مصرعوں سے زیادہ مصرعوں کے درمیان روشن ہے، جو طبعی یا oragnic ہے۔''

(فیض شناسی،صفحہ ۱۳۶)

فیض کے شعری مجموعوں ''دست صبا'' ''دستِ تہہ سنگ'اور ''سر وادئی سینا'' میں بھی بعض نظمیں ایسی ہیں۔جن کے موضوع عشقیہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی وسماجی ہیں۔ ''دستِ صبا'' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی جب وہ جیل میں تھے۔فیض احمد فیض کے جیل سے آنے کے بعدان کا مجموعہ ''زنداں نامہ'' منظر عام پر آیا۔اس میں قیدو بند کی یادگار نظمیں ہیں۔ان کے اس مجموعے میں جو موضوعات ہیں ان میں احساسات کی شدت ہے۔فیض کی شاعری میں اعلیٰ مقاصد و بلند خیالات ملتے ہیں انہوں نے اپنی بعض نظموں سے مظلوموں کو تسلی دی ہے۔یہ خلوص انہیں سچائی کی وجہ سے حاصل ہوا۔بقول مجنون گورکھپوری۔

''فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل جدید اردو نظم دونوں میں یکساں تاریخی اہمیت رکھتے ہیں ۔انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اور ان کے لئے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔''

(فیض کی شاعری،صفحہ ۴۰)

فیض کی نظموں میں تمثیل نگاری ملتی ہے۔ان کی شاعری ترنم وموسقیت سے پوری طرح لبریز ہے۔اس کے علاوہ پرُ لطف تشبیہوں واستعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر کو تراشتے ہیں ۔ان کے موضوعات میں آفاقیت ہے۔ ان کی ہمدردیاں بھی نہایت وسیع ہیں۔وہ اپنی شاعری میں لفظوں کا دلکش انتخاب کرتے ہیں۔ان کی خالص انقلابی نظموں میں موسقیت اوروزن کا اتار چڑھاؤ ہے جو کلام کو دلکش فن پارہ بنادیتا ہے۔فیض نے ایک نظم ''بول'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں یہ سارے چیزیں دیکھنے کوملتی ہیں ۔اس نظم کے اشعار کچھ اس طرح ہیں۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے	بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا	بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکاں میں	تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے	پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے	جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک	بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ۸۱)

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فیض کے کلام کا جائزہ یوں لیا ہے:

'' شاعری میں موضوع کو اِس طرح سمونا کہ شاعری موضوع اور موضوع شاعری معلوم ہونے لگے۔بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا، بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا

۔ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسّر ہو"۔

(فیض شناسی،صفحہ ۳۱)

فیض کی نظموں میں "صبح آزادی"،"۱۵۔اگست ۱۹۵۲ء"،"نثار میں تری گلیوں پر"،"میرے ہم دم میرے دوست"،"شیشوں کا مسیحا"،"سیاسی لیڈر کے نام"،"رقیب سے"،"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"،"ایرانی طلبہ کے نام"،"سوچ"،"سرِ مقتل"،"دو آوازیں"،" لوح و قلم" اور "اے دلِ بیتاب ٹھہر" وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔ان کی ایک نظم "شاعر لوگ" کے نام سے ہے جس میں زمانے کا ذکر ہے۔

ہر اک دور میں، ہم ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے

جان دیتے رہے زندگی کے لیے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لیے

دین و دنیا کی دولت لٹاتے رہے
فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہوئے

جو بھی رستہ چُنا اس پہ چلتے رہے
مال والے حقارت سے تکتے رہے

طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے
ہم نے ان پر کیا صرف حق سنگ زن

اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہوئے حکم حاکم پہ ہم

قید خانے سہے، تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے ساز دل کی صدا

اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے
خونچکاں دہر کا خونچکاں آہینہ

دُکھ بھری خلق کا دُکھ بھرا دل ہیں ہم
طبع شاعر ہے جنگاہ عدل و ستم

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ ۶۲۹)

فیض کی نظم نگاری سچائی اور انصاف کے ایوان میں نہایت متوازن ہے اور فکر وفن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ جو روایات اور تجربات، کی نئی دریافتوں کی مہر درخشاں ہے۔ فیض کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ اقبال کی طرح فیض بھی ایک پیامی شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک کے میر کارواں ہیں ان کی ابتدائی دور کی نظموں میں رومانی جذبات ملتے ہیں۔ ان نظموں میں افسردگی اور غم کی جھلک کے باوجود تلخی، بیزاری اور شکست کی فضا ہے۔ نقش فریادی کی ابتدائی نظموں ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو'' میں منظر نگاری کے نقش ہیں۔ فیض کے دل میں مظلوم انسانوں کی ہمدردی کے جذبات صاف طور پر نظر آتے ہے۔ وہ ایک ایسے عشق کے امین ہیں جو عام انسانوں کے درد کا احساس عطا کرتا ہے اور اہل زر کے مظالم پر ان کو اشکبار بناتا ہے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو　　سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہوجائے
تری مسرت پیہم تمام ہوجائے　　تری حیات تجھے تلخ جام ہوجائے
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے　　تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے　　کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنس عجز وعقیدت سے تجھ کو شاد کرے　　فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے　　وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

(نقش فریادی، صفحہ ۲۰)

فیض اپنے فن کے تقاضوں کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے مجازی عشق کو بھلا کر دنیا کے غم کو گلے لگایا۔ اس لئے ان کی شاعری میں انقلاب اور ترقی پسند

رجحانات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ترقی پسند تحریک میں شامل ہوکر اپنے دور کے حالات سے بھی مطمئن نہیں تھے۔وہ دولت کی مساوی تقسیم کے حامی تھی۔فیض احمد فیض چاہتے تھے کہ ایک غیر طبقاتی سماج قائم ہو۔وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہاں تھے جس سے یہ مقصد پورا ہوسکے۔وہ چاہتے تھے کہ محنت کش طبقے کو اپنا حق مل سکے اور ہر ایک شخص آسودہ زندگی بسر نہ کر سکے۔یہی ان کے نظموں کا پیغام بھی تھا۔بقول آلِ احمد سرور:

> فیض کی زندگی کے حسن سے محبت اور اس کے پیچھے معنویت اور رمزیت کو پانے کی کوشش ان کے کلام کو وقیع اور برگزیدہ بناتی ہے۔اس کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔اِنسانیت کے اِس پرستار کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

(فیض شناسی،صفحہ۲۲)

سماج میں پائی جانے والی نا آسودگی ،مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس نے فیض کے ذہن کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ان اثرات سے ان کے لہجے میں اداسی اور مایوسی پیدا ہوگئی یہی اثرات ان کے نظموں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔محبوب کے ساتھ ساتھ فیض کی شاعری میں غم روزگار بھی ہے اس غم سے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ وآہنگ عطا ہوا ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات ہے

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہوجائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اوربھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
لوٹ جاتی ہے ادھرکو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اوربھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

(نقش فریادی، صفحہ ۶۸)

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کے شعری افکار میں ایک الگ مکتبِ فکر ہے۔اُن کی نظموں میں اُردو کی جادوگری بھی ہے۔

اردو نظم نگاری میں باغیانہ رنگ اور انقلابی آہنگ پیدا کرنے والوں میں مخدوم محی الدین پیش پیش تھے ِان کی نظموں میں گھن اور سماج کے فرسودہ رسم ورواج اور سرمایہ داری کے خلاف سخت آواز اٹھائی گئی ہے۔اس عہد کے چھوٹے بڑے سیاسی مسائل کو نظموں کا موضوع بنایا گیا ہے ۔مخدوم کی نظموں میں ایسی فنی جمالیات کا احساس ہے جو اس سے پہلے تھی اِن کے یہاں موضوع اور ہیت کا اتنا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ان کی مہارت کا شدید احساس ہوتا ہے اور اس اعتدال وہم آہنگ اور تناسب کی وجہ

سے مخدوم کی نظمیں کامیاب ہیں۔اِن کی نظموں میں سیاسی وسماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ ہنگامی مسائل بھی ہیں۔مخدوم کے یہاں عشقیہ اور رومانی نظمیں بھی کامیاب ہیں۔اس طرح کی نظموں میں عریانیت کا سایہ نہیں پڑتا ہے۔اِن کی نظموں کی ایک اور بڑی خصوصیت غنائیت اور تغزل ہے جس کی وجہ سے ان کی نظموں کا رشتہ ماضی کی کلاسیکی شاعری سے استوار ہوجاتا ہے اور ہماری شاعری کے صحت مند ورثہ کے پاسبان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ آنے والے دور کے بہترین ترجمان بھی ہیں۔مخدوم نے خطابت، واعظانہ انداز اور کرخت لب لہجہ سے ہمیشہ دامن بچالیا۔وہ فیض احمد فیض کی طرح انقلاب کے جوش میں فن کی لطافت کو خیر باد نہیں کہتے ہیں بلکہ اس کی شگفتگی اور نرمی کو برقرار رکھتے ہیں۔انھوں نے ایک نظم ''طور'' کے عنوان سے لکھی ہے۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہو۔

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

(نظم طور، صفحہ،۱۱۴۰)

ترقی پسند میں شامل ہونے کے بعد مخدوم نے جو نظمیں لکھیں ہیں۔اُن کا رنگ نہ صرف انقلابی ہے بلکہ عشقیہ اور رومانی بھی ہے۔اِن کی نظموں میں عجیب تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے مثلاً ''سجدہ''،''انتظار''،''وہ''،''نورس''،''محبت کی چھاؤں اور پشیمانی وغیرہ شامل ہے۔ان کی نظموں میں جمالیاتی کیف اور انداز بیان کی ندرت ہے۔یہ سپردگی اور سرمستی مخدوم کی انقلابی نظموں میں اس

طرح ظاہر ہوا ہے کہ مخدوم انقلاب کا انتظار بھی اس طرح کرتا ہے۔ جیسے کوئی کسی خوش جمال محبوب کا انتظار کرتا ہے۔

اے جانِ نغمہ سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمین بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرِ رہ گذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
نہ تابناکی رخِ ہے نہ قافلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشان کلی کلی مخموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے
(نظم انقلاب، صفحہ ۱۴۱)

آپ کے مزاج میں غنایت کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زندگی میں انقلابی سپاہی ہوتے ہوئے بھی اپنی نظموں کو واعظانہ انداز اور خشکی اور کرختگی سے بچا لیا

ہے۔ مخدوم کے دوسری نظموں میں ''آتش کدہ'' قمر اور سپاہی شامل ہے۔ان نظموں کا تعلق تحریک انقلابات سے ہے۔ان کے فنی خلوص کا یہ بڑا اچھا ثبوت ہے کہ مخدوم انقلاب اور آزادی کے لیے خود بھی میدان میں اتر پڑا اور اسی وقت اس نے اپنا قلم رکھ دیا۔مخدوم ایک بلند فنکار کی حیثیت سے اردو نظم نگاری کی تاریخ میں فراموش نہ کئے جاسکیں گے۔ان کے مجموعے کلام ''سرخ سویرا'' میں سیاسی اور رومانی نظمیں ملتی ہیں۔مخدوم کی ابتدائی دور میں رومانی انداز ہے لیکن بعد کی نظموں میں سیاسی پر چھائیاں ملتی ہیں۔ان کا لہجہ حقیقت پسندانہ ہوگیا۔ان کی نظموں میں نجی معاملات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک میں مخدوم نے بھی اہم روال ادا کیا ہے۔

جوش نے بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر نظمیں کہیں ہیں۔بیسویں صدی کے عظیم اردو شاعروں میں اقبال کے بعد جوش کا نام لیا جاتا ہے۔جب جوش کا پہلا مجموعہ کلام ''روح ادب'' شائع ہوا ہے تو ان کے بزرگ اکبرالہٰ آبادی نے انھیں لکھا ''آپ کو اپنی قدر کرنی چاہیے،آپ بہت اچھے شاعر ہوسکتے ہیں''ان کا دوسرا مجموعہ کلام ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

جوش شاعر انقلاب کے خطاب سے مشہور ہیں۔جوش کی زیادہ تر نظمیں ان کے زمانے سیاسی و سماجی انتشار کی آئینہ دار ہیں۔جوش ملیح آبادی کی نظمیں انتہائی جوش وخروش سے بھری ہوئی ہیں مثلاً ترانہ آزادی وطن،شکست زندان کا خواب،ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندان سے خطاب وغیرہ ترقی پسند کے انقلابی نظمیں ہیں ۔جب ہم اِن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو جوش ملیح آبادی کی شاعری میں انگریزوں سے نفرت،غیض وغضب،بے باکی اور خوددرای کے عناصر نظر آتے ہیں۔جوش نے اپنی آنکھوں سے غلامی کا دور دیکھا ہے۔معصوم انسانوں کے قتل وخون کا نظارہ دیکھا ہے۔جوش کی شاعری

ہندوستانی کی تاریخ آزادی کی ترتیب میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔

جوش نے ایک نظم ''شکست زنداں کا خواب'' کے عنوان سے لکھی ہے اس نظم میں جوش نے زندانیوں کے حوصلہ کے داد دی ہے۔اس نظم میں جوش نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگرعوام اپنی ضد پرآ جائیں تو دنیا کوئی قید خانہ اِن کومقیدنہیں کرسکتا۔انگریزوں کومتنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عوام میں اگرآزادی کی امنگ بر پا ہوگئی تو تمام تر تدابیر ناکار ثابت ہوجائیں گئی۔جوش کہتے ہیں کہ اب شاہاں وقت مرادفرنگیوں کے چہرے سے رونق ختم ہونے والی ہے

اے جواں مردوں یہ ذلت کس لئے سہتے ہوتم

مرد ہوکرٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہوتم

یا پھر

اے جواں مردوں خدارا باندھ لوسر سے کفن

سر برہنہ پھر رہی ہے عزتِ قوم و وطن

یا پھر

یاتواب تاج پہنیں گے یا خون کفن

(شکست زنداں کا خواب،صفحہ ۹۶)

اس نظم میں جوش ملیح آبادی نے ہندوستانی عوام کے ماضی بعید کارناموں کی یاد دلا یا ہے۔جوش الفاظ کے بادشاہ ہے۔وہ الفاظ کے برمحل استعمال سے بلند آہنگی،حوصلہ کی فراخی پیدا کرتے ہیں۔ان کے لہجے میں مخصوص تراکیب تکرارلفظی کے ذریعہ گھن گرج اورغنائیت زیب دیتا ہے۔

جوش نے ''آثار انقلاب'' ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' ''ماتم آزادی'' ''ترقی پسند تحریک، انقلابی نظموں کی مثال ہے۔انگریزوں سے نجات پانے کے لئے ہندوستانی میں جو تحریک آزادی جاری تھی۔اس تحریک میں شدت پیدا کرنے کے لئے جوش نے شاعری کو مضبوط آلہ کار جانا ہے۔۱۹۲۹ء لاہور کے اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس ہوئی ہے اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو وطن پرستوں نے یوم آزادی کی شکل میں منایا تو جوش نے آزادی کا تصور مدنظر رکھتے ہوئے یوں کہا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق

حلقہ ارباب ذوق کے شعرانے بھی نظم نگاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔شعرا نے نظم میں نئ تجربے کئے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے بعد یہ تحریک اردو نظم کے فروغ اور ارتقاء کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔اس دور میں کافی نظمیں لکھی گئیں۔

آزاد نظم نگاروں میں اگر کسی کو صیح معنوں میں باغی شاعر کہا جاسکتا ہے۔تو وہ مراجی ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں چند مخصوص موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اِن کے فکروفن کے نمایاں تین اہم پہلو ہیں۔ایک جنسی فعل اور اس کے متعلقات بیان،اور دوسری اپنی نظموں میں ابہام کی کارفرمائی،تیسری آزاد نظم کی ہیت کا استعمال ہے۔یہ اِن کی شاعری کے بنیادی ستون اوران کی انفرادیت کے امتیازی نشان ہیں۔اِن کی شناخت کے ان ہی تین ابعاد کو عام طور پر ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔جنس جوان کا آدرش ہے اور جس کے آئینے میں وہ دنیا کی ہر بات کو دیکھتے ہیں انہیں بے نقاب کرنے کی ہمت نہیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

اب میراجی کے شاعری کی تیسرے پہلو پر نظر ڈالتے ہی۔ میراجی کی جنسیت، ابہام اور آزاد نظم ایک دوسرے سے اتنے وابستہ و پیوستہ ہیں کسی کو کسی سے الگ کر کے دیکھنا اور قابل ترجیح قرار دینا مشکل ہے۔ ان کی آزاد نظم موضوعات کی محدودیت کے باوجود اپنی ہی ہیت اور اپنی ہی تکنیک اور اسلوب وآہنگ کے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے مراجی نے اپنی نظموں میں مغربی آزاد نظم کی تکنیک سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، ان کی مشہور نظموں میں ترقی پسند تحریک و ادب، ہندی جوان، اونچا مکان، محبت، سرگوشیاں دکھ درد کا دارو، وغیرہ ہیں۔

اس کو ہاتھ لگایا ہوگا، ہاتھ لگانے والے نے پھول ہے رادھا، بھنورے نے ہاں کالے نے
جمنا ہٹ پر ناؤ چلائی ناؤ چلانے والے نے دھوکا کھایا، دھوکا کھایا، دھوکا کھانے والے نے
سکھیاں کب تھیں لاج بچاتیں کچھ نہ سُنی متوالے نے کام نہ آیا بات نہ رکھی اپنے دل کے اُجالے نے
دل کا اُجالا ہسنی والا، میٹھی جس کی بانی ہے ہنسی دھن کی بات نہ کہنا یہ تو پرانی کہانی ہے
اب تو ساری دنیا بدلی ہو صورت انجانی ہے دل میں سب چھایا اندھیرا ظاہری ہی نورانی ہے
یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی ہر رُت آنی جانی ہے اتنی بات دل بے چین رہے جگ میں لا فانی ہے
دل بے چین ہوا رادھا کا کون اسے بہلائے گا جمنا ہٹ کی بات تھی ہونی اب دیکھا جائے گا
چپکی سہے گی رنگ وہ رادھا جو بھی سر پہ آئے گا اودھو شیام پہیلی رہتی دنیا کو سمجھائے گا
پریم کتھا کا جادو سنے والوں کے دل پہ چھائے گا
یہ تو بتاؤ کون سورما اب کے ہاتھ لگائے گا

(نظم ترقی پسند ادب، صفحہ ۶۱)

بہرحال مراجی نے اپنی نظموں میں جنسی موضوعات پرقلم اٹھایا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ انسان کیا ہے اس پورے نظام سے انسان کا کیا تعلق ہے۔اس جنسی عمل سے وہ انسان کی حقیقت تک پہنچنا چاہتے تھے۔مراجی کو حلقہ ارباب ذوق میں بلند و بلا مقام حاصل تھا۔

ن۔م۔راشد کو بھی حلقہ ارباب کی شاعری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔وہ ایک ایسے شاعر ہے جو ہمارے سامنے ایک جدید شاعری کا تصور پیش کرتا ہے۔جس کا تعلق مغربی تہذیب سے ہے۔مغربی تعلیم کا پروردہ ہے اس کا تعلق نہ کسی مذہب سے اور نہ ہی کسی تہذیب سے ہے۔اس نے اپنے سارے مراکز گم کر دیے ہیں۔ن۔م۔راشد اپنی نظموں سے لوگوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے لوگ ایک امن کے مرکز پر جمع ہو جائیں۔ان کا نام جدید اردو شاعری کے معماروں میں سرفہرست ہے۔

آزاد اور حالی نے نظم نگاری کو باقاعدہ طور پر متعارف کرایا اور اقبال نے اس صنف سے بڑا کام لیا ۔لیکن نظم نگاری کی اس روایت میں انقلاب راشد ااور مراجی نے لائیں ہیں۔مراجی تو جواں مرگ ہوئے۔اس کے بعد راشد نے ہی نظم کو آخر تک اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔راشد کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں اِن میں ماورا،ایران میں جنبی،لا مساوی انسان،اور گماں کا ممکن ہے۔راشد نے شروع میں اقبال کے فکری سرچشمے سے فیض حاصل کیا ہے اور اقبال کی طرح شعری فکر کا مرکز اور اس کی روح رہا ہے۔

ن۔م۔راشد اُردو کے ایک اہم دانشور شاعر تھے۔اس لئے اُن کی شاعری بھی عوام کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔راشد کے نظموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک دانشورانہ مزاج کی ضرورت

ہے۔ان کے نظموں میں ایک گہری سماجی اور سیاسی بصیرت ملتی ہے۔وہ سماجی وسیاسی اور معاشی اداروں کے خلاف احتجاج بھی خوب کرتے ہیں۔راشد ترقی پسند تحریک کے سے الگ رہے۔ان کی وابستگی حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ ہے۔ اس نے اس تحریک میں غزل کے بجائے نظم کو پنا ذریعہ اظہار بنایا، اور اس میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔اس نے نظم کے روایتی سانچے سے انحراف کرکے اسلوب وآہنگ کے نئے امکانات تلاش کیے ہیں راشد نے اپنی نظموں کو جدید طرز فکر کے ساتھ جوڑ کر علامتی معنویت کی طرف توجہ دی۔ان کی بیشتر نظمیں قاری کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔اس لئے ان کی نظموں میں ابہام اور رمزیت ہے جس کا احساس ان کی ساری نظموں میں ہوتا ہے۔ن م راشد نے اپنی نظموں کے ذریعے سامراجی اور استحصالی قوموں کے سازشوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے جن سے مشرق ممالک دوچارہ رہے ہیں۔ایشاء کے مسائل اور اس خطے میں غیر ملکی سیاسی مفادات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔راشد نے اس صورت حال سے پیدا شدہ ذہنی مایوسی اور نفسیاتی الجھن کا بھی اظہار کیا ہے جس سے آج کل کا انسان دوچار ہوا ہے۔اس اعتبار سے راشد کے نظمیں اور اُن کی شاعری کا فن آفاقی منزلوں کو چھوتا ہے۔راشد نے اس موضوع کو اپنی نظموں میں بخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اردو میں آزاد نظموں کی روایت ن۔م۔راشد نے شروع کی ہے۔اس کا سہرا بھی اسی کے سر جاتا ہے۔آیئے نظم ''خودکشی کے چند اشعار بھی دیکھتے ہیں:

کرچکا ہوں آج عزم آخری شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کی نوک زباں سے ناتواں صبح ہونے تک وہ ہوجاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں تیرگی کو دیکھتا سرنگوں

منہ بسورے رہ گزاروں سے لپٹتے سوگوار گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتا ہوا

میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں کود جاؤں ساتویں منزل سے آج

آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک عشوہ ساز دہرزہ کار محبوبہ کے پاس اس تخت خواب کے نیچے مگر

آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو تازہ در خشاں لہو

بوئے مے میں بوئے خوں الجھی ہوئی

وہ ابھی تک خواب گہہ میں لوٹ کر آتی نہیں

(خودکشی، صفحہ ۱۲۴)

اُن کی یہ نظم ایک ایسے شخص کی نفسیاتی اُلجھن کو پیش کرتی ہے جو زندگی کی اُکتا دینے والی یکسانیت سے بھی بیزار ہے اور اس سے منفرد بنانا چاہتا ہے۔ان کی اکثر نظموں میں یہ بات صاف ہے کہ وہ ایک کمزور اور بے بس انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔جس کے ذہن پر تہذیب وتمدن کی اُلجھنوں کا اثر حد سے زیادہ ہوا ہو۔بہر حال اتنا کہہ سکتے ہے کہ مراجی کے ساتھ ساتھ ن م راشد نے بھی نظم کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔حلقہ ارباب ذوق کے شعرا میں ن ۔م ۔راشد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

جدید نظم نگاری کی تحریک کے معماروں میں اختر الا یمان کا نام اہم ہے جدید دور میں اختر الا ایمان خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔آزادی کے بعد اِن کا تخلیقی سفر برابر جاری رہا ہے۔اختر الایمان دور جدید میں اپنے لب ولہجہ، آہنگ اور شعری رویے میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں اسی بنا پر دوسرے شعرا سے سب

سے الگ ہیں۔اختر الایمان نے جدید اردو نظم کے فنی اور معنوی دائرے کو وسیع تر کرنے میں اہم کردار انجام دیا ہے۔اس لئے اپنے جدید خیالات اور تجربے کے موثر اظہار کے لئے وہ صنف غزل سے مفاہمت نہ کر سکے۔ اختر الایمان نے اس صنف کے سحر سے آزاد ہو کر نظم کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے۔اس لئے وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔اردو شاعری میں ان کی شناخت نظم نگار کے روپ میں ہے۔انہوں نے ایک مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کے طور پر پیش کی ہے۔

دیارِ مشرق کی آبادیوں کے اُونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں اُن کے ڈیرے میں

(نظم ایک لڑکا صفحہ ۲۶)

یہ نظم بہت طویل ہیں ایک جگہ پر اسی نظم کے چند بند بھی دیکھے:

مجھے اک لڑکا، آوارہ، منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے۔ ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں

اس سے ہمراہ پاتا ہوں ،یہ سائے کے طرح میرا

تعاقب کررہا ہے، جیسے میں مفرد ملزم ہوں

یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر ایمان تم ہی ہو؟

(نظم ایک لڑکا،صفحہ ۲۷)

بیسویں صدی میں جن شعرا نے نظم نگاری کو وقار بخشا ہے اور اس سے نئی بلندیوں سے آشنا کیا جن میں اختر الایمان کا نام نمایاں ہے۔اس نے کسی خیمہ یا نظریاتی حلقہ سے با قاعدہ وابستہ ہونے کی بجائے اپنے ہی افکار کی دنیا میں رہنا سیکھا اور ساتھ ہی سفر کرنا پسند کیا ہے۔حالانکہ اِن کا شعری مسلک ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کے بین تھا۔اختر الایمان انفرادی ذات کی سچائیوں اور معاشرتی حقائق دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں میں ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کے درمیان تیسرا زاویہ قائم کرتی ہے اسی بنا پر اختر الایمان کو اردو شاعری کی تیسری آواز بھی کہا جاتا ہے۔

ایک طرف اختر الایمان کی نظمیں جو وحدت تاثر کی کامیاب ترین مثال ہیں تو دوسری طرف یہ نہ تو حلقہ ارباب ذوق کے دائرے میں پوری اُترتی تھیں نہ ترقی پسند فارموں کے قریب تھیں۔اِن کی نظموں کی آواز الگ تھی جس کی اہمیت کا اندازہ آزادی کے بعد برسوں میں کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میراجی اور راشد کی طرح اختر الایمان نے براہ راست طریقے سے نثر میں اپنی شاعری کے بارے وضاحتی قسم کی بہت سی باتیں کہی۔ان بیانات کی مدد سے اختر الایمان نے اپنے شعری سروکار کا دفاع کیا ہے۔اختر الایمان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی علامتی انداز ہے۔مراجی اور ن م راشد کے بعد

جن نظم گو شعرا نے علامتی نظمیں لکھیں ہیں اُن میں آپ کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔اِن کی ایک نظم ''عہد وفا''اسی طرز میں ہے۔

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشم　　نم ہو یہاں اب سے کچھ سال پہلے

مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی،جس سے میں نے　　آغوش میں لے کر پوچھا تھا بیٹی

یہاں کیوں کھڑی رور رہی ہو مجھے اپنے　　بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر

وہ کہنے لگی میرا ساتھی ادھر　　اس نے انگلی اٹھا کر بتایا۔ادھراس طرف ہی

طرف سے اٹھائے کھڑی ہیں　　یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں نے سونے چاندی کے گہنے

(عہد وفا صفحہ ۳۳)

اس بارے میں اختر الایمان اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میری ں نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مشتمل ہے۔علامیہ کیا ہے اور شعر میں اس کا استعمال کس طرح ہوتا ہے۔میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا صرف اتنا ہی کہوں گا کہ علامیہ کی شاعری سیدھی سادی شاعری سے مختلف ہوتی ہے ایک تو اس لیے کہ علامیہ کا استعمال کرتے وقت شاعر کا رویہ، بالکل آمرانہ ہوتا ہے وہ ایک ہی علامیہ کو ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ معانی استعمال کر جاتا ہے۔دوسرے الفاظ کے بظاہر معانی ہوتے ہیں وہ علامیہ کی شاعری میں بدل جاتے ہیں۔مثال کے طور پر میری نظم قلو پطرہ کا پس منظر دوسری جنگ عظیم ہے اور یہ خاص لفظ

قلوہ پطرہ کو میں نے نہ اس کے تاریخی پس منظر میں استعمال ہے نہ اس

کے معنوں میں قلوہ پطرہ کے نام سے مختلف ہوتی ہے اور دونوں کی قرات

کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔''

(یادیں صفحہ ۱۵۰)

آپ کی ابتدائی زندگی بے کسی اور عزلت میں گزری ہے۔اختر الایمان گھر سے بھاگ کر یتیم خانے میں رہے۔ظاہر ہے اُن کو قدم قدم پر بیچارگی اور محرومی کا سامنا بھی کرنا پڑا اور وہ آغاز سے ہی زندگی اور اس کے مظاہر کے بارے میں سوچتے رہے۔اُن کی اس ذہنی حالت اور جذباتی ردعمل کا آغاز اُن کی ناکام محبت سے ہوا ہے۔اس نے معصوم آرزوؤں کی پامالی اور سماجی حقائق کی سنگلاخی کا احساس گہرائی سے کیا ہے۔اور وہ ردعمل کے طور پر اپنی ذات کی خاموشیوں میں محصور ہونے کی خواہش کرتے ہیں۔نظم ''مال'' کے چند بند ملاحظہ ہو۔

مٹ ہی جائیں گے یہ کمزور نقوش

جم کے بہ جاتی ہے قطبیں پہ برف

زندگی ہائینہ فردا ہے نہ دوش

عمر ہوجاتی ہے اک آہ میں صرف

(نظم مال صفحہ ۲۳)

اختر الایمان کی نظم ''لغرش''میں منظر نگاری:

خواب دیکھا تھا کسی دامن کی چھاؤں میں کبھی

لیکن ایسا خواب جس کا مدعا کوئی نہیں
میں اکیلا جا رہا ہوں اور زمین ہے سنگلاخ
اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں

(نظم لغزش صفحہ ۲۶)

اِن کی کچھ نظموں میں ہیت کی ناہمواری اور پیچیدگی کا احساس ہوتا ہے۔لیکن قاری اس سے بد دل نہیں ہوتا ہے بلکہ ریاض اور دلچسپی سے کام لیتے ہیں۔ ہیت کہ یہ پیچیدگی کچھ تو تجربے کی پیچیدگی سے منسوب ہے اور کچھ علامتی اسلوب کی پیدہ کردہ ہے،اس نے راشد اور میراجی کے بعد اردو نظموں کو نئے امکانات سے آشنا کیا ہے۔

اختر ایمان نے ایک نظم ''پگڈنڈی'' کے عنوان سے لکھی ہے کہ جس میں ایک حسینہ درماندہ سے بے بس تنہا دیکھ رہی ہے۔ یہ حسینہ اس میں زندگی کا سمبل بن جاتی ہے۔زندگی کی درماندگی ،بے بسی اور تنہائی کے تصور کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آرزوؤں اور خوابوں کے طویل سلسلے کا اظہار بھی ہوا ہے۔

ایک حسینہ درماندہ سی، بے بس، تنہا دیکھ رہی ہے
جیسے یوں ہی بڑھتے بڑھتے رنگ افق پر جا چھو لے گی
جیسے یوں ہی افتاں خیزاں جا کر تاروں کو چھو لے گی
راہ کے پیچ وخم میں کوئی راہی الجھا، دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے

ٹکراتی، کتراتی، مڑاتی، خشکی پر گرداب بناتی

(نظم پگڈنڈی،صفحہ۲۵)

ابتدائی نظم گوشعراء

اردو نظم نگاری کا پودا دکن میں بویا گیا ہے۔اور تین سو سال تک اس میں مناظر فطرت ، مذہبی اور معاشرتی موضوعات پر نظمیں لکھی گئیں ہیں۔اردو میں نظم نگاری نگاری کی تاریخ بھی وہی ہے جو اردو شاعری کی ہے۔دکنی شاعری میں بہترین اخلاقی اور صوفیانہ نظمیں لکھی گئ ہے۔اِن میں قلی قطب شاہ کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اِن کی نظموں میں ہندوستانی رنگ کے اثرات ہیں اور اپنی شاعری میں جوش و جذبات کی وجہ سے قیمتی سرمایہ ہیں۔اس نے اردو نظم نگاری کو رواج دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔اِن کے موضوعات بہت وسیع ہیں ۔اس نے مرثیہ،قصیدہ،غزل،مثنوی اور نظم نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔اِن کی فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اِن کی نظم نگاری میں موضوع بھی مختلف ہے جیسے شب برات،عید،بسنت،حُسن عشق وغیرہ ہے اِن کے نظموں کے اشعار مختلف ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں دکنی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔بسنت پر ان کی ایک مشہور نظم ہے۔

جو بن کے حوض خانے رنگ مدن بھر

سور و ماروم چرکیاں لائے دھارا

بھیگی چولی میں بھٹن نس نشانی

عجب سورج ہے کیوں کرنس کوں ٹھارا

بسنت ونت چھند سوکند گال اوپر

پھو لا یا آگ کیسر کی بہارا

بنی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ

رنگیلا ہور ہیا ترکوک سارا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ، صفحہ ۳۷۰)

محمد قلی قطب شاہ

آپ نے اپنی زندگی میں جو کچھ تحریر کیا ہے۔اس کو پرُ اثر اور پرُلطف انداز میں پیش کیا ہے۔اِن کی نظموں میں خود بخود مقامی روایات وعقائد رسم ورواج ہے۔محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں انوری بیگم اپنی کتاب میں لکھتی ہیں۔

''محمد قلی قطب شاہ نے ایرانی شاعری کی مبالغہ آمیزی اور تصنع سے اپنا دامن پاک رکھا پر تکلف اسلوب بیان سے خود کو دور رکھا۔''

(کتاب آہینہ، صفحہ ۱۳۲)

محمد قلی قطب شاہ دکن کے پہلے شاعر تھے کہ جس نے بسنت پر چودہ نظمیں لکھیں اور اس طرح پھولوں اور رنگوں کی بارش اِن کے کلام میں نظر آتی ہیں۔اِن کے دربار سے تعلق رکھنے والی عورتیں جو خود کو سنوارنے اور مسرت وشادمانی گیت گاتے تھیں۔اُن پر آپ نے نظمیں کہیں ہیں اُن نظموں میں مصوری اور جذبات نگاری ہم آہنگ ہوگئی ہے۔

شاہ کے مندر سعادت کا خبر لیایا بسنت

یہاں پتلیاں کے چمن میں پھول پھل پایا بسنت

(کلیات محمد قلی قطب شاہ، ۳۷۳)

محمد قلی قطب شاہ نے چند نظمیں ایسی بھی لکھی ہے جس میں کہیں پھولوں اور رنگوں کا تذکرہ بیان ہوا ہے۔اُن نظموں میں محمد قلی قطب شاہ نے پر تکلیف کیفیت کی تصویریں اُتار دی ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کے واقعات و تجربات اور مشاہدات میں نہ صرف تصویر کشی کی، اور نہ ہی فطرت کی نقالی کی ہے بلکہ کائنات اور فطرت خیالات سے حاصل شدہ تجربات انسانی احساسات اور داخلی تقاضوں کو بھی بیان کیا ہے۔اُن کے یہ موضوعات عوامی زندگی سے قریب نظر آتے ہیں۔محمد قلی قطب شاہ نے اپنی نظموں میں جو خیالات و جذبات کی تصویریں اُتارے ہے۔ اِن میں دکنی تہذیب وتمدن کے بہترین مرقع ہے۔ کچھ ایسی بھی نظمیں ہے جو غزل کی فارم میں ہے اِن نظموں میں پند ونصیحت، ہدایت، فکر وفلسفہ اور ہندوستانی مذہب اِس خوبی سے ہے کہ نظم نگار نے اپنی رنگیں اور پرُ لطف عیش ونشاط سے بھری زندگی کے لئے خدا کا شکر ادا کیا ہے۔اس نے اپنے دکنی الفاظوں میں حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کے تصویریں کھینچی ہیں۔

نبی صدقہ بسنت کھیلیا شہ

رنگیلا ہور ہے ترلوک سارا

نبی صدقے اے قطب شاہ اس بسنت میں

رتن سیکھ برسن عجائب دکھاتیا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ، ۳۵۶)

اس کے بارے میں ذکی کاکوروی رقمطراز ہیں۔

’’ محمد قلی قطب شاہ نے تخلیق موضوعات پر بڑی دلکش نظمیں لکھیں ہیں جو زبان کی قدامت کے باوجود شعریت سے بھر پور اور غیر معمولی ادبی اہمیت کی حاصل ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کے معاصرین شعرا کے یہاں بھی مختلف موضوعات نظمیں ملتی ہے۔اس نے اس سرمائے میں قابل ذکر اضافہ کیا ہو۔‘‘

(نظم اسائکلو پیڈ ا،صفحہ ۱۰)

سید جعفر زٹلی (-1665ء 1758ء)

دکن کے بعد شمالی ہندوستان کا رخ کرتے ہیں یہاں سے نظم نگاری کی ابتداء سترہویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔سب سے پہلا نام سید جعفر زٹلی کا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں بہت صاف گوئی سے سیاسی وسماجی اور معاشی مسائل کو بیان کیا ہے۔

آپ دراصل نازنول کے باشندے تھے۔جعفر زٹلی کا پیشہ سپاہ گری تھا۔دکنی مہمات میں بذات خود شریک تھے۔اس لئے آپ کو مغل شاہ زادوں کے کردار کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔جس کا تذکرہ اس نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔انھوں نے اپنی نظمیں طنزیہ انداز میں لکھی ہے۔اس بارے میں قدرت اللہ قاسم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''ان کے مطبوعہ دیوان کے مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ایک بیدار مغز انسان تھے ممکن ہے اپنے دور کے حالات پر طنز کرنے کے لئے انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا ہو جو کہ حالات پر گہرا طنز ہوتے ہوئے بھی ناقابل تعزیز تھا۔لیکن ایک روایت کے مطابق ان کی یہی صاف گوئی ان کی موت کا سبب بن گئی۔انھوں نے فرخ سیر کیتخت نشین ہونے پر اسے''پاد شاہ پشہ کش'' کے لقب سے یاد کیا۔لیکن یہ واقعہ تاریخی سند کا محتاج ہے۔''

(بحوالہ مجموعہ نصرت،صفحہ ۴۷)

اس کی ایک نظم جو قطعہ کی شکل میں ہے۔یہ وہ نظم ہے جو اس زمانے کی بے روزگاری اور نظام سلطنت کی بربادی کا مرقع ہے۔

ہر روز اٹھ مجرا کریں در کار یک سو گر پڑیں

بے شرم الٹے لڑ مریں یہ نوکری کا خط ہے

مردم پریشاں یک وگزشتہ سپاہی در بدر

خوردہ بے خونِ جگر یہ نوکری کا خط ہے

ششما پہ حق مرد ماں برگردن دولت رواں

تس پر سواری ناگہاں یہ نوکری کا خط ہے

(کلیات جعفر،صفحہ ۱۲۳)

صحیح معنوں میں اس قسم کی شاعری تاریخی واقعات سے زیادہ اہم ہے جو کہ فرضی تاریخ نگار

کہیں صفحات سیاہ کرنے کے بعد پورا کرتا ہے۔اس کے نظموں میں جو بھی شعر ملتا ہے وہ تاریخی دستاویز ہے۔ایسی بھی نظمیں ہیں جن میں یہ بھی حقیقت ہے کہ نہ دوستوں میں دوستی رہ گئی ہے اور نہ بھائیوں میں وفاداری ہے۔ایک طرح چغل خوری عام ہوگئی ہے تو دوسری طرح محبت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔جو لوگ ہنر مند تھے وہ رسوا ہوگئے ہیں۔اس کی جو نظموں کا پیغام تھا وہ دوسرے شاعروں سے مختلف تھا جس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہوا ہے اس زمانے میں دلی کی حالات بھی بدل گئی ہے۔اس کا کلام اس دور پر ایک گہرا طنز ہے۔اس کے کلام میں درمندی کا احساس ہے جس کی ذکر ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

> ''جعفر کا کلام اس دور کی ناہمواری اور بے ضابطہ گی پر طنز کی حیثیت رکھتا ہے سیاسی اور تہذیبی انحطاط کی وجہ سے مغلیہ شان وشوکت میں سطحیت زوال آمادگی تصنع اور بناوٹ کا جو پیوند لگنے لگا تھا۔اس کی پردہ رازی اس مخلوط اور بے ہنگم زبان کی نیم مزاحیہ،نیم سنجیدہ شاعری سے ہوتی ہے۔''
>
> (اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر،صفحہ ۲۴۹)

جعفر زٹلی نے اپنی نظموں میں سیاسی اقتصادی،سماجی معاشی مسائل کو جگہ دی ہے۔ اِن کی نظمیں اس پرُ آشوب دور کی جاگتی تصویریں ہیں۔انھوں نے اپنی نظم گوئی میں بے باکی روایت کو بھی جنم دیا ہے یہ اِن کا قابل فخر کارنامہ ہے۔جعفر زٹلی کی نظموں کی زبان بہت ہموار ہے انھوں نے اپنی نظموں میں حقیقی زندگی اور ادب کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم کیا ہے۔اِن کی یہ کوشش قابل ذکر ہے۔

جعفر کے بعد فائز کی نظموں کا جائز لیتے ہیں۔اِن کی نظموں کے جو موضوعات ہیں وہ جعفر زٹلی کی

نظموں سے مختلف ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فائز کی نظموں میں ایسے موضوعات کیوں نہیں ہیں جن کا تعلق سیاسی ومعاشی ہلچل سے ہے۔ اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے صرف قیاس ہی ممکن ہے۔ فائز نے اس زمانے میں جو نظمیں کہی ہے یہ اورنگ زیب کا آخری عہد تھا۔ اور اس زمانے میں دہلی میں نسبتاً امن وسکون تھا۔ اس بارے میں معسود حسین ادیب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''انھوں نے فائز کو جعفر زٹلی اورنگ زیب وغیرہ کا ہمعصر تسلیم کیا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فائز اپنا دیوان ۱۱۲۷ھ میں مرتب کر چکے اس لیے یہ قرین قیاس ہے۔ ان کی نظمیں بھی اس میں موجود ہوگی اور وہ یقیناً عہد عالم گیر سے تعلق رکھتی ہوں گی۔''

(مقدمہ دیوان فائز ۱۲۵)

اِن نظموں کا مخصوص انداز بھی فائز کی قدامت کا ثبوت ہے۔ اِن نظموں میں سراپا نگاری، تشبیہات واستعارات وغیرہ کا استعمال بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ فائز اس دور کا ایک ایسے شاعر تھے کہ جس نے دکنی نظمیں کی خصوصیات کو شمالی ہندوستان میں بیان کیا ہے۔ ولی دکنی نے شمالی ہند میں جو شاعری کا پودا لگا دیا ہے اس کو پروان چڑھانے میں فائز کا نمایاں کردار رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے فائز کی تقدیم کے سلسلے میں بہت سی دشواریوں کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ فائز کو آبرو، مضمون وغیرہ سے قدیم تر اور ولی سے قریب تر تسلیم کرتے ہیں۔

''ان دشواریوں کے باوجود فائز کے کلام کا عام انداز ہندی کا گہرا اثر ہندو

دیومالا کے حوالے اور زبان کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ فائزاسلوب اور
موضوع دونوں کے لحاظ سے ولی سے قریب اور آبرومضمون وغیرہ سے
الگ ہیں۔ممکن ہے ان کے کلیات کی موجودہ ترتیب بعد میں ہوئی ہو،مگر
ان کا کلام یقیناً قدیم اورارد وادب کانمونہ ہے۔''

(دہلی میں اردوشاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر،صفحہ ۲۴۸)

فائز کی خصوصیت بھی دکنی شعرا سے قریب تر ثابت کرتی ہے اس بارے میں مسعود حسین ادیب نے
اپنی کتاب میں کہا ہے۔

'' فائز کے یہاں مسلسل نظمیں بھی ہیں اور تعداد میں غزلوں سے
کہیں زیادہ ہیں مسلسل نظمیں ثابت کرتی ہیں۔ کہ جس طرح فائز ہماری
موجودہ معلومات کی بنا پر دہلی کے پہلے اردوغزل گوقرار پاتے ہیں اسی
طرح وہ دہلی کے پہلے اردونظم گوبھی ٹھہراتے ہیں۔''

(مقدمہ دیوان فائز،صفحہ ۸۹۔۹۰)

فائز نے کی نظموں میں حسن پرستی کا جذبہ ہے جیسے تعریف پنگھٹ،بہتہ میلا،دروصف بھنگڑن اور
ہولی وغیرہ ہے۔اِن نظموں میں ہندوستانی رنگ رلیوں کا بیان ہے اِن نظموں میں جذباتی کشمکش بھی
نظرآتی ہے۔ فائز کے نظموں کو پڑھ کراخلاقی قدروں کااحساس بیدار ہوجاتا ہے۔اور ایک سرورسی
کیفیت ملتی ہے۔

کنج لب پر اس کے زین بدن تھا خال

تھے دراز اس موکمر کے سے کے بال
ٹاگنی سی دو لٹاں دو اس کے بر
ہوش ان دیکھے سے جاتا تھا بسر
جو کلی تھا رنگ فندق دلِ ربا
گل سے افزوں تھی ہتھیلی میں صفا
دل فریبی کی ادا اس کی انوپ
روپ میں تھی رادہ کا سوں بھ سروپ

(نظم میلا، صفحہ۵۸)

اِن اشعار میں خوبصورت عورت کی تصویر اُبھرتی ہے۔اس سے متاثر نہ ہونا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔اِس نظم کی ابتداء اور خاتمہ میں مختلف جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔اور ان اِشعار کو پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اخلاقی پستی اگر عام تھی تو اخلاقی قدروں کا احساس ابھی فنا نہ ہوا تھا۔فائز کے رنگا رنگ اور متنوع مضامین سے بھر پور کلام کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ فائز اپنے زمانے میں بلند پایہ نظم نگار تھے۔

فائز کے معاصرین میں آبرو، ناجی، حاتم وغیرہ کو شمار کیا جاتا ہے۔ فائز نے نظموں کے علاوہ واسوخت بھی کہیں ہیں۔ فائز کو اردو کا پہلا واسوخت نگار بھی کہا جاتا ہے اِن کے دیوان میں موجودہ واسوخت ہے جس کے مندرجہ ذیل اشعار موجود ہے۔

اب وہ اخلاص ومحبت کی طرح بھول گئے غیر سے مل کے محبت کی طرح بھول گئے

چھپ کے ملنے کی محبت کی طرح بھول گئے　　جو ہمیشہ تھی وہ محبت کی طرح بھول گئے

ہربانی و محبت کی طرح بھول گئے　　پیار کی شوق کی الفت کی طرح بھول گئے

اب وہ انکھیاں تیری اے یار وہ آبروئے نہیں

وہ جو اخلاص تھا اس کی کہیں اب بوئے نہیں

(وسوخت فائز، صفحہ ۶۲)

اِن کے ترجیع بند میں دیوانگی بھی ہے اور بے وفائی کا گلہ بھی ہے آبرو نے ایک واسوخت اپنے استاد ولی دکنی کے نام لکھا ہے۔

ترے لب کو جس وقت دیکھے شراب　　ہوئے آگ میں رشک سے جل کے کباب

یوں رخسار کے مطلع نور پر　　سے خال جوں نقطہ انتخاب

قلم برق بےتاب ہوہات میں　　آپس دل کا گر میں لکھوں پیچ وتاب

ہوا دار تیرا ہےاے شجر حسن　　نہ دے دل کو برباد مثل حباب

ولی ریختے بیچ استاد ہے　　کہے آبرو کیونکہ اس کا جواب

لیکن تتبع میں کہنا سخن　　کرے فیض سوں فکر میں کامیاب

نپٹ آبرو آج بےتاب ہے　　کہواس کے اس بےوفا سے شتاب

تغافل نہ کر حال سب جان کر

جلالے مجھے ایک دم آن کر

(کلیات فائز، صفحہ ۲۴۳)

آبرو کی مشہور مثنوی ''موعظہ آرائش محفل'' جو نظم کی شکل میں عجیب وغریب ہے اس میں ایک خوب رو لڑکے کی نصیحت کو بیان کیا ہے اس میں حسن وعشق کے مخصوص موضوعات کو پیش کیا گیا ہے ۔اس بارے میں محمد حسن آبرو لکھتے ہیں۔

> '' آبرو کی حسن پرستی کھلی ڈلی ہے ۔ان کے نزدیک عشق سوز وگداز محرومی اور مایوسی ضبط نفس دردمندی سے عبارت نہیں بلکہ نشاط زیست کا مظہر ہے اس لئے ان کو زندگی کی خوب صورت چیزوں سے پیار ہے ان میں یاران بامزہ کے مجموعے بھی شامل ہیں اور ان مجموعوں کا سب سے بڑا موقع تہواروں میں ملتا ہے۔ لہذا یہ تہوار بھی عزیز ہیں۔ بسنت اور ہولی سے انھیں رغبت ہے میلے ٹھیلے بھلے لگتے ہیں ہولی پر ان کی نظم اس تہوار کی پوری کیفیت کو بیان کرتی ہے اس راستے ہندو کے رسم ورواج دیو مالا ور تلمیحات تک پہنچتے ہیں۔ان سب حوالوں کو جس بے وساختگی اور مزے سے اپنے کلام میں سمو لیتے ہیں اس کا ہمارے شعرا کے یہاں بہت کم ملے گا۔''

(مقدمہ دیوان، آبرو صفحہ ۳۲)

آبرو کے ساتھوں میں سے ایک نام شاکر ناجی کا بھی ہے۔شاکر ناجی ایہام گوئی کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔شاکر ناجی کے دیوان میں موجود مراثی ،قصیدہ ،غزل ،مخمس ،ترجیع بند اور نظم شامل ہے۔ان کی ایک آشوبیہ نظم اپنے زمانے میں نہایت ہی اہم ہے۔لیکن اس نظم کے ہمیں صرف دو ہی بند

ہی ملتے ہیں۔محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آب حیات''میں شاکر ناجی کی نظم کے اشعار کو شامل کیا ہے۔محمد حسین نے جو بند درج کیئے ہیں۔

''نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔اس وقت دربار دہلی کا رنگ شرفا کی خواری اور پاجیوں کی گرم اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور ناز پروروی کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ میں آئے۔''

(آب حیات،صفحہ ۷۷)

اس نظم میں جو بند شاکر ناجی نے لکھے ہیں اس کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔اس نے محمد شاہی اور نادر شاہی کی لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔آزاد نے بھی یہی رویت اپنی کتاب میں درج کی ہے۔

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دے دودوں کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلائی نال
قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھہرنا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا

ملت تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و دو مکاں نہ غلّہ وبقال

(آب حیات،صفحہ۵۔۱)

شاکرناجی کے معاصرین فائز،آبرو،شاکرناجی اور حاتم ہے۔حاتم نے اپنی کتاب ''دیوان زدہ'' کے نام سے لکھی ہے۔اس دیوان زدہ میں مرثیہ،مخمس،مرثیہ،نظم وغیرہ شامل ہے۔حاتم نے بہت ہی طویل عمر پائی۔ان کے کلام میں قدیم اور جدید کلام کا تعین دشوار ہے۔اس نے اصلاح زبان کے پیش نظر اپنا دیوان خود مقرر کیا تھا۔اس دیوان زدہ میں شامل نظم ''حقہ'' کی تعریف میں ہے یہ نظم قدیم دور کی تعریف میں ہے۔اس نظم میں حاتم نے صنعت ایہام کا استعمال زیادہ کیا ہے۔اس نظم کی جو زبان ہے وہ قدیم نظموں کے مقابلے میں بہت اہم ہے۔اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کہے حقہ تمباکو کیوں جلے ہے ۔۔۔ کہ گنگا جل ترے پاؤں تلے ہے
تمبا کو تو نے کہا حقہ سے جل کر ۔۔۔ آبرو کی بات ہے تو سنبھل کر
آگن میں جان کر جو جی جلا دے ۔۔۔ چمن میں عشق کے تب گل کھلا دے
پیا ہو مہربانی حقہ پلایا ۔۔۔ کرم کر لے کہ نیچے منہ لگایا
لگا وہ لب سے ایک دم میں پینے ۔۔۔ عزیز اب کر دیا عام میں پینے

نہ حقہ میں صدائے سرسری جان
کنھ ہاتھ گویا بانسری جان

(حقہ،صفحہ۱۸۹)

اس دور میں حاتم نے دو نظمیں پرآشوب کے نام سے لکھے ہیں۔ایک مخمس کی ہیت میں اور دوسری نظم مطلع ومقطع کی ہیت میں ہے۔یہ دونوں نظمیں غزل اور قصیدہ کے لئے مانا جاتا ہے۔پہلے نظم میں حاتم نے بارہ صدی کی کج رفتاری اور اس وقت کے بادشاہوں کی ناانصافی ،اور سپاہیوں کی بے قدری،اور قاضی ومفتی کی رشوت خوری،اہل کاروں کی چوری،امیروں کی تباہی اور آخر میں نیچے طبقے کی سربلندی کا تذکرہ کیا ہے۔یہ نظم ہندوستان کی سیاسی ،سماجی،معاشی اور اقتصادی صورت حال کی تصویر ہے۔اس نظم میں دلی اور ہندوستان کی عبرت انگیز انقلاب اور پیدا شدہ حالات کو بخوبی سے بیان کیا ہے۔اس وقت اِن حالات کا عملی حل لوگوں کے پاس نہ تھا۔ان حالات کو غیبی طاقتوں سے امداد کی خواہش فطری تھی۔حاتم نے اس نظم میں اسی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

حاتم کا تعلق محمد شاہی کے امراء میں سے تھا۔اِن کے نظموں میں حالات کے ستائے ہوئے درد انسان معلوم ہوتے ہیں۔اس نے اپنی طویل عمر میں زبردست انقلابات دیکھے ہیں۔اس کی جھلکیاں اِن کے نظموں میں نظر آتی ہیں۔محمد حسین آزاد نے اس کی ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔

> ''یہ پہلے شعرائے طبقہ اول کے منتخب میں شاعروں میں تھے اس وقت بھی
> زبان کی فصیح اور کلام بے تکلف تھا۔مگر پھر بھی طبقہ دوم میں داخل ہو گئے
> کلیات ان کا بہت بڑا ہے جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد رباعیات
> ومثنوی پر مشتمل ہے کتب خانہ کے لکھنو اور دہلی میں دیکھا گیا وہ شاہ
> آبرو اور ناجی کی طرز میں ہے لیکن آخر عمر میں کلیات مذکورہ سے خود انتخاب
> کر کے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا ہے اور اس کا نام ''دیوان زدہ'' رکھا۔''

(آب حیات۔ص،۱۱۴۔۱۱۵)

حاتم کے مخمس میں ستم روزگار کی بدحالی کا تذکرہ ہے۔لیکن اس کے برعکس چھوٹے پیشے والوں کی خوش حالی ذکر ہے جو حیرت انگیز ہے۔اس زمانے میں بدامنی اور آشوبی میں صنعت وتجارت سبھی کی حالت کا بگڑ نا لازمی تھا۔اس طرح سے ان کے مخمس میں دوسرے طبقوں کے مسائل اور ان کی دشواریوں پران کی نظر نہ ہوگئی ہو۔

حاتم نے اپنے نظم میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی خوب تصورات کو پیش کیا ہے یہ تصورات بڑی پردرد ہے۔اس میں واقعی حاتم کا لہجہ ایک ایسی فریاد اختیار کر لیتا ہے کہ پتھر بھی پانی ہوجائے۔

عجب یہ الٹی بہے ہے کی باؤلی دلی میں
کہ شاہ باز چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں
جنگل کو چھوڑ کے بوم آبسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

(شہرآشوب صفحہ ۶۷)

دربار کی حالت جو ہے وہ مندرجہ ذیل بندوں سے واضح ہوجاتی ہے۔

نہ کر تو جھانجھ جونقاری کی توبت ہے
مصاحبت کی اگر مسخرے کو خدمت ہے
کمینے سفلے کی اگر مرد مان میں عزت ہے

تو کیا ہوا کہ رذالے کی زر سے عزت ہے
ہے افتخار نجیبوں کا فقر وغیرت یار
کرے ہے چرخ اگر تجھ اوپر جفا حاتم
تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم
تو انقلاب زمانہ سے غم نہ کھا حاتم
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

(شہرآشوب،صفحہ ۶۸)

حاتم نے اس نظم میں اپنی ذاتی حالات کو بھی بیان کئے ہیں اس لئے نظم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔اس نظم میں شاعر کے ذاتی حالات ضمنی طور پر آ گئے ہیں یہ نظم قابل تعریف ہے۔حاتم نے اپنی نظموں میں نادرشاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے بیان کئے ہیں اِن نظموں میں درد وکرب اور سماج میں ناانصافی کو بھی پیش کیا ہے۔حاتم کے دماغ پر زبردست حادثہ کے اثرات ہیں خاص کر اِن کے اکثر نظموں میں ظلم وستم کے تذکرے اور مظلوموں کے رونے کی آواز صاف طور پر نظر آتی ہے۔حاتم نے اس ضمن میں کناری، باغوں ،ستاروں اور صرافیوں کو نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی چھوٹے طبقے لوگوں کا حال بھی لکھا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جاگیرانہ طبقہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ان طبقوں کا عروج ہورہا تھا جو کہ ایک طرح ان لوگوں کی ذاتی ہمدری کا احساس دلایا تھا۔تو دوسری طرح ان کی پریشانیوں کا ثبوت اپنی شاعری میں پیش کیا تھا۔یہی حاتم کے شاعری کی سب سے

بڑی خصوصی ہے۔آخر پر چند اشعار دیکھئے۔

حرام خور تھے اب حلال خور ہوئے

جو چور تھے سو ہوئے شاہ شاہ چور ہوئے

جو زیر دست تھے ان دنوں میں زور ہوئے

جن کو زو رتھا سواب مثال مور ہوئے

جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

(نظم شہر آشوب صفحہ ۶۷)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتے ہیں کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں نہ صرف لالہ گل اور حسن عشق کے تذکرے ہیں بلکہ موجودہ زندگی کی تصویریں ہیں۔اردو شاعری کے جس دور میں نظم کی موجودگی سے اکثر وبیشتر حضرات منکر ہیں۔یہ سب نمونے اسی دور سے پیش کئے گئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ اس دور میں تقریباً زندگی کا ہر گوشہ روشن وتاریک نظموں میں مل جاتا ہے۔

میر وسودا کے دور میں اردو شاعری کو رواج حاصل ہوا ہے۔ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور ہر لحاظ سے اہم ہے۔اس دور میں ہندوستانیوں کی باگ دوڑ ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی ہیں۔اس سیاسی پس منظر میں ہمیں ایک اجمالی نظر ڈالنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ہندوستان پر ایک ایسے قوم نے قبضہ حاصل کیا ہے کہ جس کے ادب میں نظم بہت ترقی پزیر میں موجود تھی اردو نظم نگاری کی فروغ میں یہ دور بھی شامل ہے۔اور اس دور میں دو اہم شاعر سودا اور میر موجود تھے۔میر اور سودا کے زمانے میں دبستان لکھنو اور دبستان دہلی کے مراکز قائم ہوئے ہیں۔اصلاح زبان کے سلسلے میں دہلی

اور لکھنو مشہور ہیں۔سودا اور میر نے اصلاح زبان کی زبردست کوشش کی ہے۔ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔لکھنو میں ناسخ نے اصلاح کی تحریک شروع کی ہے اور اپنی شاعری کو دہلی والوں سے منوایا ہے لیکن اس بات کو بھی ہم بھول نہیں سکتے ہیں کہ اصلاح زبان کا رجحان بھی شعرائے دہلی کے ساتھ ہی اودھ تک پہنچا تھا۔

اودھ انتہائی علم دوست اور ادب پرور انسانوں کے مرکز ہیں اس کے حکمران شجاع الدولہ،آصف الدولہ،اور اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ تھے۔اِن میں سے بادشاہ آصف علی شاہ نے شعرا کو بلند مرتبے دیئے تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔دوسری طرح دہلی سکول میں مایہ ناز شاعر پیدا ہوئے انہوں نے اردو شاعری کو باعروج مقام تک پہنچا دیا ہے۔اس دور میں شعرا کی تعداد تو بڑھ گئی ہے لیکن پہچان کرنا بہت دشواری ہے سودا میر،میر حسن،،انشاء،جرات،درد،اثر،ذوق،ناسخ،آتش،نظیر آکبر آبادی،انیس اور دبیر وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔اس ذیل میں ہمیں سب سے پہلی نظر محمد رفیع سودا کی شاعری پر پڑتی ہیں۔یوں تو سودا نے غزل اور قصیدہ لکھے ہیں۔ان کا نام اردو قصیدہ نگاری میں سب سے اونچا ہے۔سودا نے اپنی نظمیں ہجو یہ انداز میں لکھیں ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں سماجی، سیاسی،معاشرتی اخلاقی حالت پر بھرپور طنز کیا ہے۔اِن نظموں میں ایک رو یہ زوال معاشرے کی تصویر بہت واضح نظر آتی ہے۔سودا کے بارے میں شیخ چاندی نے اپنی کتاب لکھا ہے۔

> ''سودا کی سماجی نظموں میں یوں تو سب کسی نہ کسی پہلو سے اہم ہیں۔لیکن
> جن نظموں میں سیاسی حالات بھی سماجی حالات کے پہلو بہ پہلو موجود ہے
> وہ بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے ''تضحیک

روزگار'' کا ذکر ہمارے خیال میں ضرور ہے کیونکہ اس کی تقدیم نکات الشعراء، مولفہ میر تقی میر اور حمید اورنگ آبادی کے تذکرے گلشن گفتار سے ثابت ہوا ہے یہ دونوں ہی تذکرے ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نظم جو کہ قصیدے کی ہیت میں ہے ۱۱۶۵ھ سے قبل عالم وجود میں آ چکی تھی۔''

(سودا، صفحہ ۱۳۸)

سودا نے جو نظم ''تضحیک روزگار'' کے عنوان سے لکھی ہے۔اس میں چند اشعار ملاحظہ ہو۔

گھوڑا تھا جب کہ لاغر و پست وضعیف و خشک

کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کا رزاء

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس حریف پر

دوڑوں تھا اپنے پاؤں پہ جو طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں لہجا بندھی ہے شکل

لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

(تضحیک روزگار، صفحہ ۲۳)

سودا نے بہت سوچ سمجھ کر اس نظم کا نام ''تضحیک روزگار'' رکھا۔اس نظم کے علاوہ سودا نے ایک نظم ''شہر آشوب'' اور دوسری ''مخمس آشوب'' کہی ہے۔پہلی نظم ''قصیدہ شہر آشوب میں پہلے عالمگیر، بے

روزگاری کا تذکرہ ہے۔یہی نہیں بلکہ تمام فرقوں کا ذکر بھی ہے اس نظم میں مصاحب، سپاہی، حکیم،سوداگر،شاعر ،کسان،مولوی،شیخ،متوکل،خطاط،صوبیداروں،وکیل اور ڈاکٹر وغیرہ کی پریشان حالی اورزحمتوں کا تذکرہ طنزیہ انداز میں کیا گیا ہے۔اس نظم میں سودا نے بہت ہی دلچسپی سے سوداگر کا حال بیان کیا ہے۔غرض یہ سودا نے تمام فرقوں کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔

اس کی دوسری نظم آشوبیہ مخمس کے عنوان سے ہے۔جس کی ابتداء میں بے روزگاری کی شکایت کی گئی ہے پھر اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے سودا چونکہ خود سپاہی پیشہ رہ چکے تھے۔انھوں نے اس نظم میں سپاہوں کی بیکاری کے اسباب بڑے پرُسوز انداز میں بیان کئے ہیں۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سوآمد ان کی ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبہ کا غاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

(نظم آشوبیہ،صفحہ۸۲)

ایک جگہ پر آزاد آب حیات میں ہی لکھتے ہیں۔

''کہ یہ شاہ عالم اور اہل دربار کی ہجو ہے۔لیکن سودا شاہ عالم کے بادشاہ ہونے سے قبل دہلی چھوڑ چکے تھے۔سودا کے دہلی چھوڑنے اور شاہ عالم ثانی تخت نشین ہونے کا سن ۱۱۷۶ھ ہے۔ممکن ہے یہ نظم احمد شاہ عالمگیر ثانی کے عہد میں لکھی گئی ہو۔

(آب حیات، صفحہ ۳۴)

جو مصلحت کے لئے جمع ہوں صغیر و کبیر

تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر

وطن پہنچنے کی سوجی ہے بخشی کو تدبیر

کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر

کہ شاہ میانے کے بانسوں پہ نفرتی ہیں خول

بڑے کام انھیں پھر نکل کے کھائی سے

رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے

پیادے ہیں سوڈریں سر منڈاتے نائی سے

سوار گر پڑیں سوتے ہیں چارپائی سے

کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الوال

(نظم شہر آشوب، صفحہ ۹۷۵

مذکورہ اشعار میں سودا نے وقت کے بادشاہ کی خوب تصویریں کھینچی ہیں۔اوپر کے مخمس میں حقیقت حال کو بیان کیا ہے۔ایک اور جگہ پر دہلی کی بربادی کا تذکرہ بڑی دردمندی اور حسرت سے کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔اِن کے اشعار کو پڑھ کر آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔اِن نظموں میں صرف شہر دہلی کی بربادی کا ذکر ہی نہیں بلکہ شہر میں جو تباہی ہورہی ہے اس کا غم بھی ہے۔اِن کی شاعری میں عبرت انگیز مناظر ہے۔چند اشعار بھی دیکھئے۔

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر

کرو مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر

جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر

تو بیٹھ کر کہیں یوں روئیے کہ مردم شہر

گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

(نظم آشوبیہ، صفحہ ۸۷)

مذکورہ اشعار میں نظموں میں سیاسی وسماجی اور معاشرتی حالات ہے۔ سودا پنے کلام میں صرف اُن حالات کا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ اکثر تمام جزئیات پر روشنی ڈالنے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔جن کی مدد سے اس زمانے کی جو بگڑی ہوئی تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔سودا نے اپنی نظموں میں اکثر سماج شکست وریخت کی سیاسی اسباب تبصرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سودا ایک بہت بڑے شاعر تھے۔اس نے جس روایت کی ابتداء کی اس پر ان کے ہم عصروں اور شاگردوں نے بھی عمل کرنا ضرور سمجھا آپ کے شاگروں میں جعفر علی حسرت، قائم چاند پوری، شیدا اور مصحفی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔آپ کے کلیات میں اکثر نظمیں متاثر ہونے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔اس لئے اردو شاعری کے زمرے میں سودا کی نظموں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

میر تقی میر کی نظموں کا جائز لینا بہت ضروری ہے۔ میر نے بھی سودا کے ہی دور میں ہجویہ، مدحیہ اور آشوبیہ موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ان کے نظموں کے جو موضوعات ہیں وہ سادگی اور صداقت پر مبنی ہے۔ میر نے جو نظمیں کہیں ہیں وہ آپ بیتی کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی میر کی شناخت ہے۔اسی وجہ سے ان کی

نظموں کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔میر کی نظموں میں جو ہیت ہے وہ مخمس میں ہے۔اِن کی نظموں میں لشکر اور اہل لشکر کی بدحالی کا تذکرہ بھی ہے۔ان کی نظموں میں خانہ جنگی، لوٹ مار اور اخلاقی اقدار کی پستی کی بڑی دردناک تصویریں ہیں۔میر نے ایک نظم ''رد بیان کذب'' کے نام سے لکھی ہے۔یہ نظم مثنوی کی ہیت میں لکھی ہے۔سماجی میں جو بے چینی کا ماتم ہے وہ یہاں سودا کے علاوہ میر کو بھی ہے۔دونوں اس کا سبب ملکی نظم ونسق قرار دیتے ہیں۔مثنوی کا جوتذکرہ شروع ہوا ہے وہ میر کے بعد لکھنو والوں نے محسوس کیا ہے۔میر کے کرم فرما کی تصویر ملاحظہ ہو۔

خالق خادم ہے اور مخدوم   قدر والا تمہاری ہے معلوم
ہے یقینی کہ وہ اُلاغ ہے شوم   اس سعادت سے جور ہے محروم
حشر کہ ہو گا مرکب وجال

تم بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام   ہے غلامی تمہاری اپنا کام
تم کو مسجود جانتے ہیں انام   تم سبھی کے ہو پیشواؤ امام
تم سب کو نجات کا ہے سوال

شیخ جی نکلے ایک اشران میں   پھر جو دو دن میں گیا ان پاس
نئے وہ تعظیم وخلق نے وہ پاس   بولے کچھ زیر لب اداس اداس
رہ گیا چپ میں دیکھ کر یہ حال

گھر گیا شیخ جی کے سو سو بار   تھا جو سختی سے فقر کی ناچار
نہ کہا جن نے میرا حال زار   نہ رہا کوئی فوج شہ میں یار

تنگ آیا میں مفلسی سے کمال

کچھ طرح اور جب نہ بن آئی میں ہوں شیخ جی سے مجرائی

کھینچی کیا کیا انھوں سے مرزائی پر تسلی مری نہ فرمائی

مفت عزت گئی ہوا پامال

(رد بیان کذب، صفحہ ۸۴)

میر تقی میر کی اکثر نظمیں جدید زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں اس قسم کی نظموں میں میر نے اپنی زندگی کی مکمل تصویریں پیش کی ہے۔مثال کے طور پر میر نے جو ہجو نظمیں اپنے مکان کی حالات سے متاثر ہوکر کہی تھیں وہ نظم خاص طور سے اہم ہیں۔میر نے اِن نظموں میں اپنے مکان کی خستہ حالی کو بھی بیان کیا ہے۔میر نے ایک نظم ''اژدہ نامہ'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس سے ان کی عنایت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس نظم میں میر نے خود کو اژدا اور دوسرے شاعروں کو کیڑے مکوڑے سے ثابت کیا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر صفدر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''اس آہ کے مطابق یہ نظم میر کے ناپختہ اور کسی حد تک غیر صحت مند ذہن کی پیدوار ہے''

(میر اور میریات صفحہ ۱۲۴)

میر نے ایک نظم ''سنگ نامہ'' کے عنوان سے بھی لکھی ہے۔اس نظم میں میر نے اٹھاوریں صدی کے ہندوستان کی بڑی ہی دلکش تصویریں پیش کی ہے۔اس نظم میں میر نے حقیقی زندگی اور خارجی واقعات کو بے کم و کاست بیان کرنے کے سبب سے نظم نگاری کا حق مکمل طور پر ادا کیا ہے۔اس نظم کا

کینوس بہت وسیع ہے۔اس نظم میں دہلی شہر کے حالات کو بیان کیا ہے ۔اتنا ہی نہیں بلکہ اس نظم میں تمام سماجی، معاشی، تمدنی اور اخلاقی مسائل وامل کارفرما تھے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے سراپائی ایسے گھر چھوٹے دیس جاپائی
رہنا بھٹیاری کا غنیمت جان جو کہا اس نے سب گئے ہم مان

(سنگ نامہ، صفحہ ۸۹)

سن کے دل سے اس نے کھینچی آہ اور بولی واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے چار پانچ آدمی ہے پاس کھڑے
کچھ یہ کھائیں گے کچھ کھلاویں گے کچھ ہم ان کے سبب سے پاریں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

(سنگ نامہ، صفحہ ۹۰)

اِن کی چند نظمیں مختلف واقعات پر مبنی ہیں ۔اور اپنے دلچسپی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھنے کی لائق ہیں۔ میر کی زبردست قوت مشاہدہ اِن کی نظموں سے ظاہر ہوتی ہے۔انھوں نے لاجواب نظمیں لکھے ہیں جن میں ہولی، ساقی نامہ، مرغ بازار، اژدہ نامہ اور سنگ نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ان کے نظموں سے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظمیں معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہیں۔

اردو نظم کے سرمائے میں سب سے زیادہ اضافہ نظیر اکبرآبادی نے کیا ہے ان کی نظموں میں بڑا تنوع اور وسعت ہے۔نظیر اکبرآبادی نے ہر طبقے کے انسان اور اس کی زندگی کی مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اِن کے یہاں صیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کی روح جلوہ گر نظر آتی

ہے۔آپ اردو کے اول معمار تسلیم کئے جاتے ہیں۔انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ کر شعر وادب کوعوام سے قریب لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج نظیر اکبر آبادی کی انفرادیت کو اردو ہر نقاد ماننے کئے لیے تیار ہے۔

خورشید ہو کر نکلا ہے اپنے گھر سے　　　لیتا ہے مول بادل کر کر تلاش زر سے

آئی ہوا لے کر بھی بادل کو ہر نگر سے　　　آدھے اساڑھ تو اب دشمن کے گھر سے بر سے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

قاصد صبا کے دوڑے ہر طرف منھ اُٹھا کر　　　ہر کوہ ودشت کہتے ہیں یوں سُنا کر

ہاں سبز جوڑے پہنو ہر دم نہا نہا کر　　　کوئی کو میگھ راجا دیکھے گا سب کو آ کر

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

جب یہ نوید پہونچی صحرا میں ایک باری　　　ہونے لگی وہاں پھر برسات کی تیاری

چشموں میں کوہ کے بھی ہوئی سب کے انتظاری　　　موسم کے جانور بھی آتے ہیں باری باری

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

اگر کہیں مزے کی ننھی پُھہار بر سے　　　چیزوں کا رنگ چھٹ کر حُسن ونکھار بر سے

اک طرف اولتی کی باہم قطار بر سے　　　چھاجوں اُمنڈ کے پانی موسل کی دھار بر سے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہر کوہ کی کمر تک سبزہ ہے لہلہاتا　　　برسے ہے مینھ جھڑا جھڑ پانی بہا ہے جاتا

وحش وطیور ہر اک مل مل کے ہے نہاتا　　　غوطہ کریں مینڈ جھینگر ہے غُل مچاتا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

کالی گھٹا ہے ہردم برسے ہیں مینھ کی دھاریں اور جس میں اُڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں

کوئل کوکیں اور کوک کر پکاریں اور مور مست ہو کر جوں وکوکلا چنگاریں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

کالی گھٹائیں آ کر ہو مست تُل رہی ہیں دستاریں سُرخ اُس میں کیا خوب کھل رہی ہیں

رخساروں پر بہاریں ہراک کے ڈُھل رہی ہیں شبنم کی بوندیں جیسے ہر گل پہ تُل رہی ہیں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے جگنو چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے

لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہاتھوں میں ہے ہراک کے پھولوں کی لال چھڑیاں بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں

گل بوندوں کے جواوپر بوندیں ہیں مینھ کی پڑیاں برسیں گویا ہزاروں اب موتیوں کی لڑیاں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(کلیات نظیر،۵۵۶،۵۵۷،۵۵۸)

آپ کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں پند و نصیحت اور اخلاق کی تعلیم کے بے شمار مواقع نکل آتے ہیں ۔انھوں نے بے شمار نظمیں لکھی ہے جن میں کچھ اہم بھی شامل ہے جیسے بنجارہ نامہ،روٹی،نامہ،اہل دنیا،خدا کی پہچان،دنیا دھوکے کی ٹٹی اور کلجگ وغیرہ قابل ذکر ہے۔

برگِ اشجار وہ سر سبز ہیں اور نرم و لطف فی المثل حُلّہ جنت انھیں کہیے تو جا بجا

کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا مخملِ تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا

الغرض دشت تو ہیں کار گہِ مخمل سبز

اور جو ہیں کوہ تو اُن پر بھی زمرد ہے فدا

جان سے کرتی ہے اب نزہت و حضرت وہ سلوک جیسے غنچوں سے نسیمِ سحر اور گل سے صبا

ہے زمین چمن و باغ جو پانی سی سفید اس میں اب عکس اب ہر ایک گل کا ہے یوں جلوہ نما

عقل کہتی ہے تامّل سے جسے دیکھ کر یہ

طشتِ بلّور ہے اقسامِ جواہر سے بھرا

شاخ پر گُل سے یہ عالم ہے جیسے محبوب سُرخ دستار بسر رکھتا ہے اور سبز قبا

ہلتے اِس لُطف سے ہیں بھیگے تازہ نہال جیسی ہو نازنیں دلبر کے نہانے کی ادا

غلغہ رعد خوش آتا ہے ہر ایک گوش کو یوں

جیسے شادی میں پسند آتی ہے نوبت کی صدا

برق بھی چمکے ہے اور دمکے ہے ایسی ہر دم جس سے کیا کیا اُمنڈ اور جھوم کے آئے ہے گھٹا

اس سیہِ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے لبِ مالیدہِ مسّی میں در دنداں کی صفا

بدلیاں بدلے ہیں وہ رنگ نئے ہر ساعت

جن کے ہر رنگ پر ہومانی کے بھی فدا

(کلیاتِ نظیر، صفحہ ۵۶۶)

نظیر اکبر آبادی نے ایک نظم ''آدمی نامہ'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ نظم نظیر اکبر آبادی کی نمائندہ نظم ہے۔اس نظم میں نظیر نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت خوبصورتی اور دلداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس نظم میں وہ انسان کے مختلف خصلتوں کو بیان کرتے ہیں۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں اور آدمی ہی ان کے چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ،صفحہ ۵۵۷)

نظیر اکبر آبادی کو ہر مذہب اور ملت کے لوگ عزیز رکھتے تھے۔مسلمان صوفیوں کے علاوہ ہندو سے بھی نظیر کو عقیدت تھی۔ ہندوستان میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں گزرا ہے جس کی شاعری سے ایکتا ،اور بھائی چارہ قومی یکجاتی کی ایسی تعلیم ملتی جیسی کہ نظیر آکبر آبادی کی شاعری سے ملتی ہے۔نظیر اکبر آبادی نے ایسی بھی نظمیں کہیں ہیں جو صرف اپنے ملک کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر انسانوں کی خوشیوں اور دکھ درد سے متعلق ہیں۔چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھنا مہارت ہے یہ وہی انسان کر سکتا ہے جس کا دل میں ہمدری اور مشاہدہ میں عام زندگی کا احساس ہو یہ سب خصوصیات نظیر کے یہاں ملتی ہے ان کے نظموں میں معاشی مسائل کے اظہار خیال بھی ملتا ہے۔اس کی مثال اس کی نظم ''مفلسی'' سے دی جاسکتی ہے۔ہنس نامہ اور بنجارہ نامہ نظیر کی علامتی نظمیں ہیں۔

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گوں تری ڈھل جاوے گی

اک بدھیا تیری مٹی پر بھر گھاس نہ چرنے آوے گی

یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑ ا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(مفلسی،صفحہ ۲۶۷)

نظیر نے اپنی نظموں میں عام بول چال کی زبان کو استعمال کیا ہے۔ان کی اس زبان میں کہیں کہیں کھڑی بولی اور برج زبان کی بھی گھل مل جاتی ہے۔نظیر آ کبر آبادی کو عربی، فارسی، پنجابی، اور اودھی زبان سے بھی واقفیت حاصل تھی۔وہ ان زبانوں کے الفاظوں کو با آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔نظیر جس چیز کا بیان کرتے ہیں۔اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ان کی ہر نظم مکمل تصویر کی مرقع ہے۔اور اپنے کلیات میں ایک ضغیم البم ہے۔ان کی ایک نظم ''ہولی'' کے نام سے ہے اس نظم میں گرد رنگ بکھرتا نظر آنے لگتا ہے۔اس نظم میں نظیر اکبر آبادی نے پیرائی کے میلے کا نقشہ کھینچا ہے جس میں چشم تصور میں دریا کی تصویر اُبھر آتی ہے۔اس نظم میں نظیر سوچ سمجھ کر تشبیہ اور استعارہ کا انتخاب کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی میں تنگ دستی اور غریبی کی تصویر کشی اپنی نظم مفلسی میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

دروازہ پہ زنانے بجاتے ہیں تالیاں
اور گھر میں بیٹھی ڈومنی دیتی ہے گالیاں
مالن گلے کا ہار ہودوڑی لے ڈالیاں

سقا کھڑا سناتا ہے باتیں رزالیاں
یہ خوری پہ خرابی دکھاتی ہے مفلسی

(ہولی،صفحہ ۱۵۶)

نظیر اکبرآبادی نے اپنی نظموں میں عوامی زندگی کے ہر پہلو کو موضوع بنایا ہے۔اورعوام کے ہر دل عزیز شاعر بھی کہلائے اس لئے جدید نقادوں نے انھیں عوامی شاعر مانا ہے۔

چوتھا باب:

اردو نظم میں منظر نگاری

(۱) قدرت کی عکاسی

(۲) فطرت کی عکاسی

قدرت کی عکاسی

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دورِ قدیم سے لے کر دورِ حاضر تک نظموں کی تخلیق کی گئی ہے۔اس دور میں بہت زیادہ شعرا نظر آتے ہیں۔لیکن اِن میں کچھ شعرا ایسے ہیں کہ انھوں نے منظر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ چنانچہ اگر ہم دکنی شاعری کا ایک جائزہ لیں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ یہاں پہلے سے ہی نظم گو شعرا نے نہ صرف مناظرِ قدرت کی عکاسی کی بلکہ کامیابی بھی حاصل کی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اِن نظم گو شعرا نے اپنے بیانات کی بنیاد مشاہدہ پر رکھی ہے اِن میں دکن کے پانچویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی منظر نگاری کا انحصار اس کے ذاتی مشاہدات پر ہے اس لیے اِن کی نظموں میں منظریہ تصویریں واضح اور روشن ہیں اور تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے ایسی نظمیں کہی ہیں کہ جس میں مناظرِ قدرت کا بیان ملتا ہے۔اِن نظموں میں منظر نگاری کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے محض ایک مصور کی حیثیت سے مناظرِ قدرت کے نقشے ہی نہیں اُتارے ہیں بلکہ اِن میں اپنے جذبات بھی شامل کر دیئے ہیں۔اس کی نظموں میں منظر نگاری کے حسین تشبیہات کا بھی استعمال ہوتا ہے۔دراصل محمد قلی قطب شاہ فطرت پرست شاعر ہے۔اس کو ہندوستان کے موسموں سے دلچسپی تھی اس لیے آپ نے ہندوستان موسموں پر حسین نظمیں کہی ہیں۔آپ نے موسمِ برسات پر ۱۳ نظمیں کہی ہیں۔جن کا تعلق مناظرِ قدرت سے ہے محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں محی الدین قادری زور لکھتے ہیں۔

''یہی وجہ ہی کہ محمد قلی قطب شاہ نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی، اور جس روز برسات کا موسم شروع ہوتا ہے۔وہ بڑی دھوم دھام سے مجلس

آرائی کرتا اس میں مطربان خوش نوا رقص وسُرور کے کمال دکھاتے، باغوں
میں جھولے ڈالے جاتے عشق وعاشقی کے جذبات ہونے لگتے سہیلیاں
مشک وزعفران، وغیرہ مل کر اپنے جسم پر لگاتے اور بیر بہوٹی کے رنگ
کے سُرخ کپڑے زیب تن کر لیتی پھول اور پان کے طبق تقسیم کیے
جاتے۔اور تمام محلات شاہی میں زمردہی رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں
اور ہر طرح خوشی وخرمی کا اظہار کیا جاتا۔''

(سلطان قلی قطب شاہ، صفحہ ۲۰)

موسم برسات کے علاوہ موسم بسنت پر آپ نے سات نظمیں کہیں اور ایک قصیدہ بھی لکھا ہے اس نے یہ نظم ''نوروز'' کے عنوان سے لکھا ہے اس میں دکنی الفاظ شامل ہے۔

نورانی نو روز نوران سوں آیا — حمل حسب حالاں نے حضرت تھے دھایا
جگا جوت جگ میں وجھل کار جھم جھم — چمن جوگ چندر نمن جگ جگایا
کرم کر سو کستورکسکم گلا کر — کٹنی کو یلان کا ستاگن منایا
ہوا ہے ہوا ہر طرف ہر جنس کا — ہوس سوں ہری بن ہزراں ہلایا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ، صفحہ ۱۲۹)

بہر حال مناظر قدرت کی تصویر کشی محمد قلی قطب شاہ کی نظموں سے شروع ہوتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے مناظر قدرت کے حسین جلوے اپنی آنکھوں سے دیکھئے ہیں اِن کی شاعری میں منظر نگاری بالکل فرضی ہوتی ہے۔جن کے پلاٹ کا تعلق غیر مما لک سے ہے۔مثلاً بہت سے نظم

نگاروں کے تعداد میں چین ،مصر اور عرب کے حقیقی قصے نظم کیے ہیں اور قصے کے دوران میں مناظر قدرت کے بھی نقشے کھینچے ہیں۔ظاہر ہے کہ شعرا نے بذات خود چین ،مصر اور عرب کے مناظر نہیں دیکھے ہیں بلکہ اپنی تمثیل کی بنا پر مناظر قدرت کی عکاسی کی ہے۔چند شعرا پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر چین ،مصر اور عرب کی منظر نگاری کرتے ہیں۔چونکہ بہت سے مناظر قدرت ہر ملک میں یکساں ہوتے ہیں۔مثلاً صبح ،شام ،رات ،آندھی ،سمندر اور طوفان وغیرہ زیادہ تر ہر ملک میں ایک ہی قسم کا منظر پیش کرتے ہیں۔اس لئے اردو شعرا نے اپنے ملک کے مناظر کی روشنی میں دیگر مما لک کے مناظر کی عکاسی کی کوشش کی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔کہ ان شعرا کی منظر کشی پر عمومیت کا رنگ غالب آ گیا دوسری طرح ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ مختلف مما لک کے مناظر قدرت یکساں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔مثلاً جنگل پہاڑ اور وادی وغیرہ یکسانیت میں شک وشبہ ہے۔مگر نظم نگار شعرا نے مناظر قدرت کے بیانات میں قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔اور اپنی اشعاروں میں ہندوستان کے پھل پھول اور گلشن وصحرا کو مد نظر رکھ کر اپنی شاعری میں دیگر مناظر قدرت کے تصویریں اُتار دی ہیں۔

اب ذیل کے سطور میں ہندوستان کے مختلف شعرا کی منظر نگاری سے بحث کی جائے تا کہ پتہ چلے گا کہ قدرت کے بنائے ہوئے جیل، پہاڑ ،ندی اور نالے وغیرہ کا تذکرہ کس طرح اپنی نظموں کے ذریعے پیش کرتے ہیں ۔اس کی مثال نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے لیا جاسکتا ہے۔نظیر اکبرآبادی اردو نظم نگاری میں اونچے مقام رکھتے ہیں۔آپ نے اپنی دور میں زیادہ اہم نظمیں کہی ہے۔مثلاً اس کی ایک نظم ''برسات'' کے عنوان سے ہے اس نے موسم برسات کے اُس نہایت صیح اور سچے تجربات پیش

کیے ہیں کہ جس میں

مناظر قدرت کی عکاسی ہے۔

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے اُمس

گرمی کے بڑھانے کی عجب ہر ہے اُمس

پانی سے پسینوں کی بڑی ہر ہے اُمس

ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر ہے اُمس

برسات کے موسم میں بہت زہر ہی اُمس

ہر چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

ادھر تو پسینوں سے پڑی بھیگے ہیں کھاٹیں

گرمی سے ادھر میل کی کچھ چیوٹیاں کاٹیں

کپڑا جو پہینے تو پسینے اس سے آئیں

ننگا جو بدن رکھے تو پھر مکھیاں چاٹیں

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہی اُمس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُمس

(برسات، صفحہ ۵۶۲)

مذکورہ اشعار کو پڑھنے سے اُمس کی صیح کیفیت بھی ہم پر طاری ہوجاتی ہے۔نظیر کے اِن الفاظ میں کس قدر مناظر قدرت کی صداقت ہے۔کہ اگر اُومس کے وقت کپڑے پہنیں تو وہ پسینہ میں ڈوب

جاتے ہیں اور اگر کپڑے اتار دیں تو مکھیاں کاٹتی ہیں یہ منظر کشی نظیر اکبر آبادی کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے۔ یہاں نظیر نے تخیل سے کام لیا ہے۔جس کی وجہ سے اس نظم میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے نظیر کی یہاں اس قسم کی کافی نظمیں ملتی ہیں۔جن میں قدرتی مناظر کی عکاسی ہے۔انھوں نے اس قسم کے نظموں میں اپنے جذبات کو شامل کیا ہے مگر یہاں بھی اپنی منظر نگاری ملتی ہیں۔جس میں اُن کے یہاں جذبات عشق بھی شامل ہیں۔اس حولے سے نظیر کی دوسری نظم بہار کے عنوان سے ہے جس میں نظیر نے بہار کے حسین مناظر قدرت پیش کیے ہیں۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں　　سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھم جھماہٹ قطرات کی بہاریں　　ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاری

بادل ہوا کے وپر ہو مست چھا رہے ہیں　　جھڑیوں کی مستیوں سے دھوم مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں　　گلزار بھیگتے ہی سبزے بہار ہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں　　گل پھول جھاڑ بونے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہی ہیں　　اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے　　قدرت کے بچھ رہے ہر جا ہرے بچھوے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے　　بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی اور چھارہی گھٹائیں سُرخ اور سفید کاری
سب بھیگتے ہیں گھر گھر ماہ تا بہ ماہی یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یارب سامان تیری قدرت بدلے ہی رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا اور مور کی زٹل میں تیرا ہی پیام ہے گا
یہ رنگ سو مزے کا جو صبح شام ہے گا یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں اُدھر کے کر شور ناچتے ہیں پیارے کا نام لے کر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا سے گھر کر گھنگھور ناچتے ہیں مینڈک اچھل ہے اور مور ناچتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(برسات، صفحہ ۶۸)

نظیر اکبرآبادی کی منظر نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِن کے یہاں خیالی اور قیاسی تصویریں ہی نہیں ملتی ہیں بلکہ اِن تصویروں میں اِن کے مشاہدات شامل ہیں۔اس بارے میں کلیم الدین احمد کی رائے ہیں۔

''غرض مختلف قسم کی تصویریں ہیں اور کہیں کامیاب کی ہر تصویر میں حقیقت
کی جھلک ہے اِن میں سے کوئی بھی فرضی وخیالی نہیں نظیر حقیقت طراز
شاعر ہیں۔ جو چیزیں وہ گرد وپیش میں دیکھتے ہیں اِن کی جیتی جاگتی تصویر
یں اُتارتے ہیں اور یہ سب چیزیں خاص ہندوستان کی فضا میں سانس
لیتی ہیں۔ اِن میں ذرا بھی اجنبیت کی بُو نہیں اس قسم کی نظمیں اُردو میں
نایاب ہیں۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، صفحہ ۲۹)

ہندوستان کے مختلف نقادوں نے قدرتی منظر نگاری پر غور کیا ہے اور اردو نظموں میں منظر نگاری کے اسباب دریافت کئے ہیں اس بارے میں شیخ محمد اکرام اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے۔ کہ انگریزی کی کئی بلند پایہ نظمیں قدرتی مناظر کے متعلق ہیں
اور انگریزی ادب میں ان مناظر کی شاعری کو ایک خاص درجہ حاصل ہے
لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ انگلستان میں بالخصوص اُن
اضلاع میں جہاں کثرت سے جھیلیں ہیں شاندار مناظر قدرت کی جو
فروانی ہے وہ دہلی کے گرد نواح بلکہ ہندوستان بھر میسر نہیں۔ اور اگر کئیں
دہلوی شاعر اس خیال سے مرعوب، ہوکر کہ انگریزی شاعری میں مناظر
قدرت کے متعلق نظمیں ہیں خود بھی اونچے پہاڑوں اور خوشنما جھیلوں کے
مناظر کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تو ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ اِن

نیچرل یا مصنوعی شاعری کوئی نہ ہوگی کیونکہ شاعر نے تو خود یہ مناظر دیکھے
ہی نہیں۔ جو لوگ گرم ملکوں اور چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں۔انھیں وہ
دل فریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر،
سوئزلینڈ،انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے بعض اضلاع میں مبہم پہنچائے
ہیں۔ان میں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔اور وہ نسبتاً
محدود ہیں۔مثلاً چاندرات،صُبح وشام،شفق کی رنگینی،دریا کا کنارہ
،بسنت بہار، برسات،اُردو میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں۔

(حکیم فرزانہ،صفحہ ۹۷)

شیخ محمد اکرم نے اُردو شاعری میں منظر نگاری کے اسباب بتائے ہیں۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں مناظر قدرت کی تصویریں دہلی کی گردنواح سے ہے۔ جہاں پر واقع جمنا کے کنارے ہے دور قدیم اور دور متوسطہ اور دور متاخر کے لئے شاعر ایسے ہیں جو جمنا سے محفوظ ہیں اور اس پر نظمیں بھی کہی ہیں۔ مناظر قدرت کا یہ مطلب نہیں' کہ صرف ندی، پہاڑ،گلشن،اور چشموں پر نظمیں کہی جائیں حالانکہ دہلی کے شعرا ستارے، چاند،سورج، بادل،شفق،قوس اور قزح وغیرہ کے بارے میں نظمیں کہہ سکتے ہیں۔اور اس طرح منظر نگاری کا حق ادا کر سکتے تھے۔شیخ محمد اکرام نے کہا ہے کہ چاندنی صبح وشام،شفق کی رنگینی،،دریا کا کنارہ ، بسنت، بہار اور برسات کے متعلق اُردو میں کئی نظمیں دور جدید میں کہی گئی ہیں۔دور قدیم میں نظیر اکبر آبادی کے علاوہ بہت کم شعرا نے اِن موضوعات پر اپنے آپ کو آزمایا ہے،جس کی ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مناظر قدرت کے بارے

میں سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں مختلف باغوں کا ذکر کیا ہے۔

باغ حیات بخش، مہتاب باغ شالہ مار، باغ روشن آرا، باغ سرہندی، باغ محل داری خاں، باغ ناظر وغیرہ باغ دہلی کے مغلیہ دور میں موجود تھے بہر حال یہ بات تو بالکل طے ہے کہ جب دہلی کے شعرا نے شاعری کا آغاز کیا اس وقت دہلی میں بہت سے باغات تھے یہ شعرا اِن باغات پر نظمیں کہہ سکتے تھے۔

(آثار الصنادید، صفحہ ۲۳۹)

اگر ہم مناظر قدرت کے حوالے سے پہاڑوں پر غور کریں تو ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر کوہ ہمالیہ، کوہ ہندوکش، اور کوہ سلیمانی وغیرہ موجود ہیں۔ اِن پہاڑوں سے متاثر ہو کر اقبال نے ایک مشہور نظم ''ہمالیہ'' کے نام سے لکھی ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہے۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان ‏ چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں ‏ تو جواں ہے گردش شام وسحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے ‏ تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

امتحان یدہ ظاہر میں کوہستاں ہے تو ‏ پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستاں ہے تو

مطلع اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو ‏ سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو

برف باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر ‏ خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن ‏ وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن / تو زمین پراور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمہ دامن تیرا آئینہ سیال ہے / دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے
ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے / تازیانہ دے دیا برق سرکوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے / دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر / فیل ہے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی / جھومتی ہے نشہ ہستی میں برگل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خاموشی / دست گل چین کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

(ہمالیہ،صفحہ۲۱۱)

اس نظم میں ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں کہ

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ میرا / کنج خلوت خانہ قدرت ہے کا شانہ میرا
آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی / کوثر وتسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی / سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دل نشین کے ساز کو / اے مسافر دل سمجھتا ہے تیری آواز کو
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا / وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کوہسار پر / خوش نما لگتا ہے یہ غازہ تیرے رخسار پر
اے ہمالہ داستان اس وقت کی کوئی سنا / مسکن آبائے انسان جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا / داغ جس پر غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

(ہمالیہ،صفحہ،۲۱۲)

اسی طرح وسطی ہندوستان میں کوہ اراد لی ،کوہ بندھیاچل اور کوہ ست پڑا اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔دکن میں مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ کے سلسلے واقع ہیں۔ہندوستان میں ندیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔گنگا، جمنا،گھاگرا،بیاس،راوی چناب،جھیلم،سندھ،گوداوری،کرشنا،وغیرہ ہندوستان کے مشہور دریا ہیں۔البتہ یہاں پر جھیلوں کی کمی ہے۔پھر بھی مان سر دور،جھیل ڈل،صوبا کی جھیل اور چلکا جھیل وغیرہ ہندوستان میں جلوہ گر ہیں۔ہندوستان میں بندرابن اور سندر بن دومشہور جنگل بھی ہیں۔اس کے علاوہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے ایک بحر ہند اور بحر عرب ہندوستان کو تین طرف سے حلقے میں لیے ہیں۔ہندوستان میں بہار کا بھی موسم آتا ہے۔یہاں پر بسنت اور برسات کو بہار سمجھے،اس کے علاہ یہاں مختلف قسم کے طیور اور مویشی بھی موجود ہیں۔قدرت نے یہاں پر پھولوں اور میوؤں کو بھی بنانے میں کمی نہیں رکھا ہے۔قدرت کے بنائے ہوئے حسین پہاڑ اور شہر موجود ہیں۔جن کو ہم صحت گاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔اِن میں دو پہاڑوں کی ذکر ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی کیا ہیں۔

''ایک جگہ ڈاکٹر گستاولی بان نے نیل گری پہاڑی کی بہت سی تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جنوب کی طرف یہ مغربی گھاٹ دفعتہً ایک بلندی پیدا کی ہیں کہ جس میں نیلگری کا مشہور پہاڑ ہے جو اپنی آب و ہوا اور خوش منظری کے لحاظ سے دکن کا سویز لینڈ ہے۔

(تمدن ہند،صفحہ ۲۴،۲۵)

ریگستانی علاقہ میں قدرتی مناظر موجود ہیں۔اس حوالے سے مولوی حکیم نجم الغنی رامپوری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''جابجا سرسبز شاداب درخت ،قسم قسم کے خودرو پھول اور صاف وشفاف پانی کے چشمے نظر آتے ہیں۔ہوا ہمیشہ تازہ اور ٹھنڈی چلتی ہے۔ یہاں تک کہ گرمیوں میں بھی گرم ہوا یا لو کبھی نہیں چلتی ۔اس پہاڑ میں کیوڑہ ،کیتکی اور گلاب کے جنگل ہیں چمپا،چنبیلی اور سیوتی بے کثرت پھولتی ہے۔''

(تاریخ راجگان ہند،صفحہ ۸۷)

بہرحال ہندوستان میں مناظر کی کمی نہیں ہے۔اگر مناظر کی کی کمی ہوتی تو ہندو،انگریزی،سنسکرت کے شعرا اِن کا ذکر اپنی شاعری میں کیسے کرتے۔بالیکی نے رامائن میں ہندوستان کے قدرتی مناظر کا ذکر کیا ہے۔رام جب لچھمن اور سیتا کے ساتھ پنچ وٹی پہنچے اس مقام کا نقشہ بالیکی نے ہندو کی مشہور کتاب رامائن میں کھینچا ہے۔

''یہ مقام ہموار اور حسین ہے ۔اس کے چاروں طرف پھولے ہوئے درخت ہیں پاس ہی پاس ہی کنویوں سے آراستہ پوکھر بھی ہے۔وہ گوداوری ندی بھی ہے اور اس کے دونوں کناروں پر شگفتہ پھول موجود ہیں۔یہاں ،جل مرغ اور چکر واک پرندوں کا ہجوم ہے۔آس پاس

پیاسے ہرنوں کا جھنڈا پانی پینے کے لیے بیٹھا ہے ایک طرف مور بول رہا ہے۔حسین اور بلند پہاڑ پھولوں سے ڈھکے ہیں، پہاڑوں پر سونا چاندی اور تانبے کی دھاتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہاتھی کے جسم پر مصوری کی گئی ہے۔سال ،تال ،کھجور،کٹھل ص اور سپاری کے درختوں سے یہ پہاڑ سجا ہوا ہے۔آم،اشوک،تنک اور کیل کے درختوں پر بلبیں لپٹی ہوئی ہیں۔

(رامائن،صفحہ،۵۰۲،۵۰۳)

رامائن کا اردو ترجمہ خود شاستری نے کیا ہے اور اس کا مطالعہ بھی بتایا ہے۔کہ اس میں قدرتی مناظر کثرت سے پیش کیے ہیں۔حالانکہ مہابھارت میں اس موقع پر ہندوستان کے جنگل اور پہاڑ ہم کو نظر آتے ہیں۔اس جنگل اور پہاڑ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں۔

''بہت سے پہاڑ ،ندی،نالے ،جنگل ،خونخوار جانور ، پرندے اور بھوت وغیرہ کو دیکھتی ہوئی اور جدائی کو دیوانگی میں ان سے راجا لنکا پتا پوچھتی ہوئی وہ شمال کی طرف بڑھنے لگی۔''

(رامائن،صفحہ،۵۰۴)

قدرت کی حسین مصوری ہم کو کالی داس کے یہاں بھی ملتی ہے۔ان کی ایک تصنیف ''راگھو ومکا'' اس میں شاعر نے رام چندر کے آباد واجداد اور اُن کے اولاد کے حالات نظم کیے ہیں۔اس میں منظر نگاری موجود ہے۔اس میں بھی قدرتی مناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔

کالیداس کی غنائی نظموں میں منظر نگاری اور زیادہ نکھرے ہوئے روپ میں ملتی ہے۔اس کی نظم میگھ دوت میں منظر نگاری کا لاجواب شہکار ہے۔اس کا عنوان ہی بتاتا ہے کہ اس کا تعلق منظر نگاری سے ہے۔اس نظم کا موضوع یہ ہے کہ یکش رشی دولت کے دیوتا کا خادم ہے۔ایک بار اس نے اپنے مخدوم کی نافرمانی کی ہے۔اس کو سزا کے طور پر وسطِ ہند میں رام گری کے کنجوں میں قید کردیا گیا۔ایک دن مایوسی کے عالم میں اس نے ایک سیاہ بادل کو شمال کی جانب جاتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی دور افتادہ بیوی کو جو ہمالیہ کے دامن میں رہتی تھی۔پیغام بھیجا یہ نظم ہندی میں ہے اس نظم کے حصے میں مکیش ان مختلف مناظر کا ذکر کرتا ہے جن سے بادل شمال کی جانبِ جاتے ہوئے دوچارہ ہوگا۔مثلاً وہ کہتا ہے کہ راستہ میں اس کو امراکتا پہاڑ ملے گا اس کو لازم ہے کہ وہ وہاں کے جنگلوں کی آگ بجھائے اس کے بعد ایک ندی ملے گی جو وندھیا پہاڑوں کے نشیب میں بہتی ہے۔اس کے علاوہ تراوتی کا چشمہ ملے گا۔کسروکشیتر کا مقدسّ خطہ نظر آئے گا پھر گنگا ندی ملے گی۔اور پھر پہاڑی سلسلے نظر آئیں گے جہاں سے گنگا نکلتی ہے یوں ہی رفتہ رفتہ بال کیلاش پہاڑ کے اگلا مقام تک پہونچ جائے گا۔

چار جانب جو یوں نظر ڈالی ناگہاں چھا گئی گھٹا کالی
جھوم کر ابر جب مچلتا تھا مست ہاتھی کی چال چلتا تھا
نت نیا تھا بہار کا نقشہ لہلہایا پہاڑ پر سبزہ
گردِ سبزے کے ناچتے تھے مُور پیاری پیاری صداؤں کا تھا شور
چوٹیوں پر پہاڑ کے بادل نظر آتے تھے صاف دَل کے دل
مور پھولوں پر ناچتے تھے وہاں گُل میخانہ تھا زمین کا سَماں

چھوٹی چھوٹی اِدھر اُدھر بندیاں

کچھ نیا ہی دکھا رہی تھیں سماں

(ترپاٹھی پرداسی، صفحہ ۱۳۸)

مذکورہ اشعار میں سنسکرت شاعری سے مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قدرتی مناظر کی فروانی ہے جہاں قدیم دور میں چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اس حوالے سے عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

''اس زمانے میں مناظر قدرت کے دکھانے کا سبب سے بڑا کمال یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مخصوص الفاظ استعمال کیے جائیں کہ خود ان کے ذریعہ کسی نظر کی تصویر کھینچ جائے۔''

(شعرالہند، صفحہ ۴۵۲)

اردو شاعری میں فطرت یعنی قدرت کو ہمیشہ شہکار گردانا ہے۔ وہ ہماری وید ہوں پر جن میں مہابھارت، رامائن، کالیداس اول تو یہ خود قدرت کے حُسن کے آئینہ دار مزیے اور فریضے اور اِفکار معتبر وزریں ہونے کے علاوہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ایک انقلاب لانے والے ماخذ اور مربوط سلسلہ وار، غیر تغیر پزیز غیر معمولی نقوش اور شاعری کے بہترین شاہکار ہیں۔ مقدس وقابل تعظیم ہیں بلکہ ہماری اخلاقی، سماجی مذہبی، اقتصادی و ثقافتی قدروں کے تازہ گُل بوٹے ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری زندگیوں کے گلزار کہلانے والے سرچشمے ہیں۔ فضلیت اور برکات کا نقشِ اول ہیں قدرت کے لامثال بے پناہ اور لازوال حُسن کے مظہر ہیں۔

جس وقت نہ سورج تھا نہ مہتاب نہ تارے
پنہاں کسی پردے میں تھے بجلی کے شرارے
جس وقت نہ گرمی تھی نہ سردی تھی نہ برسات
ظاہر تھے یہ جب شام وسحر اور نہ دن رات
جس وقت نہ موجیں تھیں نہ موجوں کا تلاطم
نے ابرِ خرد شندہ نہ باراں کا ترنم
خاموش تھا محفل قدرت کا ہر ساز
اُٹھتی تھی نہ جس وقت کسی چیز سے آواز
جس وقت نہ بجلی تھی نہ بال نہ تجارت
نئے معدنیات اور نہ آثار نہ نباتات

(نذر آزاد، صفحہ ۷۵)

حالی کی طرز پر منظر کشی کی کوشش کرنے سے پہلے چکبست نے انیس کی مرصع طرز میں ایک خالص منظر کشی کی نظم کہی تھی۔ وہ اس طرز میں زیادہ کامیاب رہے ہیں اور بعد کی متعلق مناظر قدرت نظموں میں بھی انھوں نے یہ طرز قائم رکھا ہے۔ حالانکہ کہ مرصع سازی میں انھوں نے تخفیف کردی ہے۔ اس نظم کا عنوان ''جلوہ صبح''اور اس میں صبح کے منظر کا بیان ہے۔ اس سے کچھ مثالیں دی جارہی ہیں۔ چکبست اس نظم کو تشبیہات کی بھرمار کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم

چکر میں تھا گرداب صفت نیر اعظم
اٹھتی تھیں جو موجوں کی شعائیں وہ شرردم
سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم
تھی شورش طوفان سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینہ مہ گردوں کا ہوا غرق

(جلوہ صبح، صفحہ ۹۷)

اس منظرکشی کی کلاسیکی طرز کے مطابق تقریباً ہمیشہ قدرت کو اللہ کی پرستش کار کی صورت دکھایا جاتا ہے۔نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں اس قسم کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔یہاں تک کہ پرندوں کا بیان کرتے وقت بھی نظیر سارے پرندوں کو احمد الہیٰ میں رطب اللسان دکھاتے ہیں۔چکبست نے بھی اس کلاسیکی روایت کی پیروی کی ہے۔

مرغان چمن عالمِ مستی میں سحردم
وصف چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم
شاخیں تھیں کہیں گردن تسلیم صفت خم
تسبیح خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کے بھی تھی ورزبانِ حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِّ علیٰ کی

(ادبی تخلیقات، صفحہ ۹۸)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چکبست قدرت کے ساتھ بہت مضبوطی سے جُڑے ہیں۔چکبست نے قدرت کی منظرکشی خالص منظرکشی کی نظموں کے علاوہ حب الوطنی کے جذبات اُبھارنے کے لے(جیسا انھوں نے بچوں کے لیے کہی گئی نظموں میں کیا ہے)اور مرثیوں کے طرز کہی گئی لمبی نظموں کے چہرے کے طور پر بھی کیا ہے۔اس بات میں کوئی خصوصیت نہیں ہے کیوں کہ کئی دوسرے شعرا نے بھی ایسا کیا ہے۔لیکن چکبست کی منظرنگاری ایسی جگہوں پر بھی دکھائی دیتی ہے۔جہاں اس کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔مثلاًلارڈ کرزن کی مذمت میں کہی ہوئی لمبی نظم کو وہ قصیدوں کی تشبیب کی طرز پر منظر صبح کی بیان سے شروع کرتے ہیں۔

تھا شب تار میں تاروں کا فلک پر جمگھٹ

چھپ گیا آنکھ سے بدلی جوز میں پر کروٹ

دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارہ چمکا

وہ عروسِ سحرِ نور نے لٹا گھونگھٹ

بڑھ کے رضوان نے جنت کے دریچے کھولے

آئی وہ گلشنِ فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اُٹھا پیرِ فلک بانگ لگائی ایسی

مرغ نے گریہ مسکیں کی جو پائی آہٹ

گد گدایا جو نسیم سحری نے آکر

ناز سے سبزہ خوابیدہ نے بدلی کروٹ

نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں
گل کھلے ہیں کہ ہے پریوں کا چمن میں جمگھٹ

(ادبی تخلیقات، صفحہ ۹۸)

یہاں اس سے بھی زیادہ قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ وہ مراثی میں بھی اس عنصر کو داخل کر دیتے ہیں۔ چکبست نے گنگا پرشاد ورما کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے اس مرثیہ میں کمال کی منظر نگاری ہے۔ اس مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

پیڑ سر سبزہ ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے
ڈوبتی کرنوں سے فوارے میں اک تاب بھی ہے
گل نوخیز بھی ہیں سبزہ شاداب بھی ہے
شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے
تو کہاں ہے کہ جو اس باغ کا شیدائی ہے
تجھ سے ملنے کے لیے فصل بہار آئی ہے

(ادبی تخلیقات، صفحہ ۹۹)

ایک اور جگہ پر قدرت کی عکاسی دیکھئے:

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون | عجیب خطّہ دلکش ہے شہر دیرہ دون
تمام شہر گرد و غبار سے خالی | جدھر نگاہ اُٹھے اُس طرف ہی ہریالی
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمین شاداب | لطیف سرد ہوا پاک وصاف چشمہ آب

طلسمِ حُسن کا ہی بیچ میں یہ گلدستہ کھڑے ہیں کوہِ شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آ کے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جایئے بستی سے اور ہی سماں یہ سوچتا ہی پہاڑوں کو دیکھ انساں
بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا یہ بل زمین کی تیوری پہ آ گیا کیسا
بس ایک عالم ہو چاہ سمت طاری ہی نہ شورشر ہے نہ دنیا کی آہ وزاری ہی
فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمہ دلگیر شجر ہجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سُنے گا اسے دلگداز ہے جس کا ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہو جس کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور مے ہوکر
ہوس تھی روح کامل جائی اس میں لے ہوکر

(بندرابن کی صبح، صفحہ ۱۱۸)

محروم نے مظاہر قدرت پر بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اِن چیزوں کا ذکر اردو شاعری میں پہلے بھی آتا تھا۔ لیکن وہ تو اٹھارویں صدی کی انگریزی شاعری کی طرح بہت کچھ روایتی اور کتابی ہوتا تھا۔ یعنی شاعروں کے ذاتی مشاہدے اور تجربہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ جب ہم اس طرح کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ِان باتوں کی بیان کرنے میں شاعر دلی لگاؤ کو بھی کچھ دخل

ہے۔ بلکہ کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے جذبات یا خیالات کے اظہار کے لیے ان چیزوں کے رسمی تصورات سے استفادہ کر رہا ہے۔ اس بات کو شاعری میں تحریک اصلاح کے پیش رووٴں نے بھی محسوس کیا، جس کا نتیجہ حالی کی ''برکھارُت'' ایسی نظمیں ہیں۔ اس طرح یہ خیال تو تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ قدرت کی منظر نگاری واقعیت پر مبنی ہونی چاہیے۔

دراصل شاعر کو ذاتی تجربات کی بنا پر مناظر قدرت سے متعلق لکھنا چاہیے۔ جس طرح اٹھارویں صدی کے بعد انگلستان میں رومانی تجدید کے شاعروں مثال کے طور پر ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، اِن سب کو مظاہر قدرت سے بہت لگاوٴ تھا۔ یہ مناظر اِن کے دلوں میں جس طرح لرزش اور آہنگ پیدا کرتے تھے۔ وہ صلاح پسند شاعروں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ ویسے ہی اِن انگریزی شاعروں کی ایسی نظمیں بھی اِن کے پیش نظر نہیں تھیں۔ پھر فنی صلاحیت کی بات بھی ہے اور جہاں تک محروم کا تعلق ہے انھوں نے انگریزی نظمیں پڑھی تھی۔ انگریزی شاعری کا بھی کچھ علم تھا۔ اس ضمن میں ورڈز ورتھ کے تتبع کی کوشش بھی غالباً انھوں نے کی ہے لیکن ایک تو انگریزی شاعری کا مطالعہ بہت وسیع نہیں معلوم ہوتا ۔ دوسرے اگر ایسا ہوتا تب بھی اُن رومانی شاعروں کی جذباتی لطافتوں اور نزاکتوں اور ساتھ ہی تخیل کی بلندیوں تک پہنچنا اِن کے لیے بہت دشوار تھا۔ انگریزی شاعری وکٹورین کے عہد میں ان خصوصیات اور معیار کو برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کے باوجود محروم کی اس نوع کی نظموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے اکثر بڑا لطف آتا ہے۔ اس سے شاعر کے کمالِ فن کا انداز ہوتا ہے۔ بہر حال ایک بات تو ہے کہ محروم کی مظاہر قدرت سے متعلق نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

شہر کی گلیوں میں گھبراتا ہوں میں دل بہلانے یہاں آتا ہوں میں

دل کی آسائش یہاں پاتا ہوں میں تیری وسعت پر مٹا جاتا ہوں میں

گو نہیں مجھ کو جنوں سودا نہیں

تجھ سے بڑھ جائیں کہیں صحرا نہیں

شہر ہے میرے لئے وشت جنوں دل کو وہاں حاصل نہیں ہوتا سکون

شعلہ زن ہے آتش دُنیا ئے دوں رکھتی ہے دل کو صدا سیماب گوں

آہ پر تیری نسیم خوشگوار

ہے مجھے سرمایہ صبر و قرار

ہیں فریب شہر کچھ باغ وچمن بے گماں ہے دلکش جن کی پھبن

ہیں شگفتہ ان میں نسریں وسمن طائر اِن خوشنوا ہیں نغمہ زن

بلبل وگل کے مگر جھگڑوں کے خار

پہلوئے تسکیں کو کرتے ہیں فگار

روبرو ہے ہر طرف ساری زمین صاف آتا ہے نظر چرخ بریں

جنگل کی فجائے دل نشیں کوہ و دریا کے مناظر ہیں کہیں

گھومتا ہے ہر طرف خطِ نظر

مرکز ادوار عالم ہے بشر

ہے ترا ہر فصل میں منظر نیا دیکھتا ہوں میں تجھے اکثر نیا

سبز جوڑا ہے کبھی تن پر نیا لالہ و گل کا کبھی زیور نیا

سال میں کیا کیا بدلتا رنگ ہے
اِک سے اِک بڑھ کر نکلتا رنگ ہے

تو ٹھکانا غم کے اُوروں کے لئے امن کا گھر بے قراروں کے لئے
دل کی رات دل فگاروں کے لئے الغرض ایسے ہزاروں کے لئے

دہر میں اک بے بدل مادا ہے تو
جنت الماوا ہے صحرا ہے تو

(نظم صحرا، صفحہ ۱۳۲)

آپ کی یہ نظمیں ایسے عناصر سے قطعی پاک ہیں جنھیں واقعیت کے خلاف سمجھا جا سکے۔ پھر ان میں سے کئی شاعر کے ذاتی مشاہدہ کی تازگی بھی موجود ہے۔ اِن کی نظموں میں اسلوبِ بیان میں خلوص کی جدت بھی ہے اور تاثیر بھی۔ مطالعہ کی سہولت کے لیے اِن نظموں کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

اِن کی کچھ نظمیں تو ایسی ہیں کہ جن میں شاعری کی توجہ فطرت کے مناظر اور مظاہر کے حُسن پر مرکوز رہی ہے۔ اِن سے حاصل ہونے والے کیف وسرور کو لطیف استعاروں اور تخیل کی نکتہ آفرینیوں میں رنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ اِن نظموں کی اہمیت زیادہ تر جمالیاتی ہے ہاں اگر چہ ان میں کہیں کہیں مظاہر قدرت کی اَفادی خصوصیات بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہیں پھر بھی ان میں بہار اور بسنت پر کئی نظمیں ہیں۔ مثلاً آفتاب، دھوپ، وقت سحر وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا اندازہ ان دو تین شعروں سے ہوسکتا ہے۔ جو نظم دھوپ سے نقل کیے جاتے ہیں۔

تصویرِ حُسن ، آبِ گہر سے ڈھلی ہوئی
یا ہے کوئی حسین حقیقت کھلی ہوئی
سرمایہ نشاط ہے یہ دل پزیر دھوپ
قوت فزائے دل ہے کہ ہے جوئے شیر دھوپ

(دھوپ، صفحہ ۲۷)

محروم کے دوسری قسم کی نظمیں دیکھتے ہیں کہ جن میں شاعر کا مقصد منظر نگاری کے سہارے کسی فلسفیانہ یا اخلاقی تصور کا اظہار ہوتا ہے۔ادب میں خیال جذبہ آجاتا ہے اور مظاہر قدرت کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ جاتی ہے۔یوں تو محروم کی نظم ''مہتاب'' ایسی نظموں میں بھی جن کی فضا حُسن و جمال کے قمقموں سے جگماتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی کبھی انسانی زندگی پر چھائی ہوئی غم کی تاریکی کا ذکر کر گزرتا ہے ۔لیکن یوں لگتا ہے کہ جیسے کچھ نظمیں لکھی ہوئی اس لئے گئی ہیں کہ ان نظموں میں یہ بتایا جائے کہ زندگی انسانی روح پر ایک بارِگراں ہے یعنی زندگی حباب وسراب ہے،فنا ہر شے کا مقدر ہے۔جن چیزوں کا آغاز شاندار اور مسرت ہوتا ہے اِن کا انجام عبرت ناک ہے۔نظم ''سبزہ نو'' کے چند بند دیکھتے ہیں کہ جس میں یہ موجود ہے۔

گلہائے لطفِ دنیا ہر چند چیدنی ہیں نظارہ ہائے عالم دلکش دیدنی ہیں
لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے افسوس دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے

(افکارِ محروم، صفحہ ۲۷)

ظاہر ہے کہ اِن نظموں کا موضوع سنجیدہ ہے جس سے مظاہر قدرت کے لباس میں پیش کیا جاتا

ہے۔ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں۔ جنھیں یہ تصورات اہم معلوم ہوتے ہیں۔اس لیے یہ نظمیں بھی قابلِ قدر محسوس ہوں گی، لیکن دوسرے لوگوں کا اِن سے زیادہ لطف اندوز ہونا بہت ہی مشکل ہیں۔ان سے زیادہ دلکش وہ نظمیں محسوس ہوتی ہیں جن میں شاعر کی طبعیت میں جاگزیں غم مناظر قدرت میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔اس طرح یہ داخلی اور خارجی افسردگی ہم رنگ وہم آہنگ ہوکر ایسی نظموں کی فضا کو غم آلود بنادیتی ہے۔اس بارے میں اِس کی ایک نظم ''بلبلہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔

چھوٹا سا ایک خیمہ آبی کہوں اسے
یا گنبد فلک سے میں تشبیہ دوں اسے
کس نازنیں کی بزم کا یا رب یہ جام ہے
سارے جہاں کی نازکی جس پر تمام ہے

(بلبلہ،صفحہ ۱۵۷)

اِن نظموں کے علاوہ محروم کی اور بھی ایسی نظمیں ہے کہ جن میں مظاہر قدرت کی تصویر صاف طور پر نظر آتی ہے۔ یہ نظمیں محروم کے انفرادی تجربات سے تعلق رکھتی ہیں۔اس لیے اِن میں خلوص کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہ نظمیں ہیں ''سندھ کو پیغام'' اور دریائے سندھ کی یاد'' پہلی ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی۔ جب محروم سندھ سے جدا ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزارا تھا۔ دوسری اس سے اکتالیس سال بعد ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی جب محروم جمنا کے کنارے آکر آباد ہو چکے تھے۔اس بات کی ذکر آچکی ہے کہ محروم کا لڑکپن ایک ایسے مقام پر گزراتھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔انھیں سندھ کے ساحل سے لگاؤ تھا جہاں وہ سیر کو جاتے اور دریا کی فضا سے لطف انداز ہوتے تھے۔ بہرحال یہ نظمیں شاعر کے

بچپن اور جوانی کی دلکش یادوں پر مبنی ہیں۔اِن نظموں میں مناظر قدرت کی جھلک صاف ہے۔اِن نظموں میں دوسری طرح گردشِ ایام کو لوٹانے کی بے پناہ آرزو بھی ہے۔

بھولا نہیں عالم تری امواج رواں کا وہ ماضی رقصاں مری عمر گزراں کا

تو ار تلاطم وہ میرے ذوقِ نہاں کا افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا

گورشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا

طفلی بھی جوانی بھی،وہیں چھوڑ کے آیا

(افکارِ محروم،صفحہ ۳۰)

دور جدید میں منظر نگاری کو بطور پس منظر احسان دانش نے استعمال کیا ہے۔اِن کی نظموں کا خاص اسلوب یہی ہے کہ وہ پہلے مختلف مناظر قدرت کا بیان کرتے ہیں اس کے بعد اصل نظم شروع کرتے ہیں۔مناظر قدرت کا بیان احسان بالکل ضمنی طور پر پیش کرتے ہیں۔اس کا اصل مقصد اپنی نظموں کے ذریعہ سماجی گتھیوں کو سلجھانا ہے۔احسان دانش غریب طبقے کے ترجمان ہیں اس لیے وہ شاعر مزدور کہلاتے ہیں لیکن یہ ضمنی منظریہ بیانات بھی اہم ہیں۔احسان دانش نے فطری جزئیات اور تفصیلات کو اس قدر سادہ اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔کہ اس میں اصل سماں نظروں کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔احسان کی عقبی زمین کی مصوری دو قسم کی ہوتی ہیں۔پہلی قسم کی مصوری وہ ہے کہ جس کو وہ اپنی عشقیہ نظموں سے قبل پیش کرتے ہیں۔اس منظر نگاری میں قدرت کے شاداب اور مُسکراتے ہوئے نظارے جلوہ دکھاتے ہیں۔

فلک پہ مشرق کے آئینہ میں سحر مُسکرا رہی ہے

جمائیاں لے رہی ہیں کلیاں صبا کرشمے دکھا رہی ہے
چمن کو خوش لحن طائروں نے بنا دیا درس گاہ نغمہ
نسیم کم عمر ٹہنیوں کو لپک کے ملنا سکھا رہی ہے
کھُلا ہوا ہے قدم قدم پر تجلیوں کا نگاہ خانہ
اُٹھتی ہے ہستی ہوئی بشاشت، غنودگی دم چُرا رہی ہے
جبینِ مشرق سے ڈھل رہی ہیں جمی ہوئی رات بھر کی کاکک
بصدادا ہر شعاعِ زریں درِ نظر کھٹکھٹا رہی ہے
اسی ہجوم جمالِ و بو میں کنار جو اک حسین دیوی
سحر کی خاموشی ساعتوں کا کلام کرنا سکھا رہی ہے
صلیبح چہرہ، کشیدہ ابرو، جبیں کشادہ ، دراز گیسو
حیا کی تصویر بن رہی ہے، فضا کے نقشے بنا رہی ہے

(چراغاں، صفحہ ۵۵)

اس نظم میں مصوری زیادہ کمال کی ہے کہیں کہیں اشعار میں تغزل بھی زیادہ پایا جاتا ہے۔لیکن ایک لحاظ سے یہ نظم کامیاب ہے ۔دراصل حسین نظاروں اور حسین چہروں کا چولی دامن کے ساتھ ہے۔اس میں پرُ کیف نظاروں میں حُسن محبوب اور بھی نکھر جاتا ہے ۔اس لحاظ سے احسان دانش کی اس منظر نگاری میں ایک جذباتی ہم آہنگی موجود ہے۔احسان دانش جب بھی اپنی نظموں میں غمگین جذبات پیش کرتے ہیں۔اُس وقت بھی وہ مناظر قدرت کو حسین دکھاتے ہیں۔ہاں اگر چہ فطری طور پر ان

مناظر قدرت کو غمگین ہونا چاہیے۔اس حوالے سے اِن کی ایک نظم میں یہ مناظر قدرت موجود ہے۔

صبح دم اک دن فلک پر ہلکا ہلکا ابر تھا
رقص کرتی تھی فضاؤں میں ہوائے جانفزا
پھول کی ہر ایک پتی پر تھا فطرت کا نکھار
دل پہ جادو کر رہا تھا رنگ و بُوئے لالہ زار
دفعتاً چمکی افق پر مہر کی پہلی کِرن
جگمگا اُٹھتی گلابی بدلیوں کی انجمن
صبح نے یوں پھونک دی ہر جسم میں روح بہار
جس طرح سبزے پہ ہو برسات میں پہلی پھوار
جھونکا جھونکا تھا شراب خوشگوار حسن دوست
خارتراروں میں جھلکتی تھی بہار حسن دوست
جا رہا تھا والہانہ طرز سے گاتا ہوا
اشرف المخلوق کہلانے پہ اتراتا ہوا

(چراغاں،صفحہ۲۵،۲۶)

مذکورہ اشعار میں احسان دانش نے فطرت کا مشاہدہ کیا ہے اور قدرت کے مناظر کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔انھوں نے اپنی بعض نظموں میں جو مناظر قدرت کی عکاسی کی ہے صاف وسادہ اور سلیس الفاظ میں پیش کیے ہیں۔انھیں نے ایک مصور کا آرٹ پوشیدہ نظر آتا ہے۔

ہوائیں دم بخود ہیں دَم گھٹا جاتا ہے سینے میں
مئے جذبات ہے بے رنگ دل کے آبگینے میں
خس وخاک شاک ہیں تو نسے ہوئے پتا نہیں ہلتا
گلستان تمنا میں کوئی غنچہ نہیں کھلتا
جدھر دیکھو درد دیوار سے آنچیں نکلتی ہیں
پسینہ بہہ رہا ہے ہڈیاں شاید پگھلتی ہیں
اُداسی کا سماں ہے مرگزاروں گلستانوں میں
چھپے بیٹھے ہیں خوش الحاں طائر آشیانوں میں
لپٹ دیکھے ہوئے شعلوں کی آتی ہی ہواؤں میں
جہنم جذب ہوکر رہ گئے شاید فضاؤں میں

(چراغاں،صفحہ،۱۰۳)

برسات کی گرمی کی یہ صحیح تصویر ہے۔جو بناوٹ اور تصنع اور آدر سے پاک ہے۔احسان دانش نے ذاتی تجربہ کی بنا پر گرمی کی شدت اس کا ذکر بخوبی سے کیا ہے۔آپ کے اس بیان میں مبالغہ کی آمیزش بہت کم ہے۔اسی وجہ سے وہ منظر نگاری کے صحیح تصویر ہمارے سامنے کھینچے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

احسان دانش نے اس نظم کو غزل کے انداز پیش نہیں کیا ہے۔اس لیے وہ قافیہ پیمائی کی زنجیر میں اسیر نہیں ہوئے ہیں۔انھوں نے مناظر قدرت کو غزل کے انداز میں پیش کیا ہے۔وہاں انھوں نے اتنی کامیابی حاصل نہیں کی ہے''نظم جلوہ صبح'' کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہے وقت سحر چمکے ہیں فطرت کے خزینے
نکلا ہوں مئے گل، مگر شوق سے پینے
وہ عرش کی قندیل ہو یا طور کی بجلی
سب ہیں میری تخیل کے روندے ہوئے زینے
جھونکوں میں ہواؤں کے ترنم کی لچک ہے
سبزے پہ ہیں ٹپکے ہوئے کلیوں کے پسینے
کلیوں کے حسین عکس ہیں زروں کی جبیں پر
جس طرح سلیماں کی انگوٹھی کے نگینے

(چراغاں،صفحہ ۱۳۱)

مذکورہ اشعار کا انداز بہت دلکش ہے۔اس کے ساتھ ہی اِن اشعار میں ترنم کوٹ کوٹ بھرا گیا ہے۔مگر جہاں تک صبح کی منظر نگاری کا تعلق ہے یہ اشعار زیادہ ہی واضح ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ احسان دانش نے اپنی شاعری میں مناظر قدرت کا حق ادا کیا ہے۔

''نقد رواں'' میں چودھری جگت موہن لال رواں نے بھی منظر نگاری پیش کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ایک روز سدھارتھ کے باپ نے سدھارتھ سے کہا کہ فصل بہار آ گئی ہیں اور اس موسم میں یہ فائدہ رہا ہے کہ ایک روز بادشاہ بھی کسانوں کے ساتھ ہل چلاتا ہے۔اس لیے آج تم کو بھی ہل چلانا ہوگا۔وہ اس بات سے راضی ہوگیا کہ شہزدہ اور دیگر اراکین سلطنت چل دیئے۔اگر چہ اس میں منظر کشی کی تخیلی ہے کیونکہ رواں نے سدھارتھ کے عہد کا کپل دستو نہیں دیکھا ہے۔اور نہ اس عہد کے قدرتی

مناظر کا نظارہ کیا ہے۔مگر انھوں نے ہندوستان کے مناظر قدرت ضرور دیکھے ہیں۔اس تجزیہ کی روشنی میں انھوں نے سادھارتھ کے عہد کے کپل دستو کے قدرتی مناظر پیش کیے ہیں اوراس منظر کشی میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔صحرا کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

تھی وہاں فصل بہاری حکمران دید کے قاتل تھا جنگل کا سماں

پُھوٹ نکلی تھی شگوفوں سے شمیم چھیڑتی چلتی تھی غنچوں کو نسیم

جھاڑیوں میں تتلیاں ہر رنگ کی زرد، نیلی، سُرخ، عنابی، ہری

طائران خوش نما تھے، نغمہ ریز، جنت کے پھولوں سے میدان عطریز

جابجا جنگل میں جو تالاب تھے جلوہ زار حلقہ گرداب تھے

چھوٹے چھوٹے کیڑے سطح آب پر تیرتے اوراُڑتے آتے تھے نظر

مچھلیاں پانی میں ہو کر بے قرار دیکھتی تھیں اُڑ کے جنگل کی بہار

اوج پر چلیں جہاں منڈلاتی تھیں ہر طرف حلقے بناتی جاتی تھیں

فاختہ کا کچھ عجب انداز تھا لمحے لمحے پر نیاز و ناز تھا

ڈالیوں پر گونج کے مستانہ وار ہر کبوتر مائل بوس و کنار

طر طے اُڑ اُڑ کر سماں کھلاتے تھے آگے

پیچھے غول کے غول آتے تھے

جانور نزدیک تر، اور دُور تر سب چراگاہوں میں آتے ہیں نظر

چوکڑی سبزے پہ گائیں بھرتی ہیں دوپ چرتی ہیں، کلیلیں کرتی ہیں

ٹھٹ کی ٹھٹ بھیڑیں کھڑی ہیں صف پہ صف ‎ ‎ اک طرف چھوٹی بڑی ہیں اک طرف

بکرے آپس میں لڑائی کے لیے ‎ ‎ بھڑتے ہیں زور آزمائی کے لیے

ہر طرف جھینگر میں یوں نغمہ طراز

جیسے سُر بھرتے ہوں تنہائی نوازِ

(نقدرواں،صفحہ ۲۳،۲۴)

مذکورہ اشعار میں صحرا کی جس قدر واضح تصویریں ملتی ہیں۔ دوسری جگہ مشکل سے ملیں گی۔ مذکورہ اشعار سے پتا چلتا ہے کہ رواں کا مشاہدہ کتنا عمیق تھا جس کا اندازہ لگنا مشکل ہے۔ جنگل کی تصویریں مختلف شعرا نے کھینچی ہیں مگر غالباً بہت کم شعرا نے تالاب پر کیڑوں کے تیرنے اور اُڑنے کا منظر یہ پیش کیا ہے۔ ''نقد رواں'' میں رواں نے اور بھی دیگر مقامات پر بھی قدرتی مصوری کے کمالات دکھائے ہیں۔ سدھارتھ نے جنگل میں جب پہلی رات بسر کی ہے۔ اس رات کا منظر رواں نے کھینچا ہے

وہ بھانک دشت وہ ہو کا مقام ‎ ‎ تیرگی میں قبر کی ہم سر وہ شام

کالے کالے وہ فلک پیما شجر ‎ ‎ ہول کھائے جن کو انسان دیکھ کر

وہ درختوں کے گھنے سائے مئیب ‎ ‎ قبر گول گھوپے وہیں ان کے قریب

سوکھے پتوں کا کھڑکنا بار بار ‎ ‎ سوتی چڑیوں کا پھڑکنا بار بار

بونکتے تھے شیر اس انداز سے ‎ ‎ کانپ کانپ اُٹھتا تھا دشت آواز سے

گیڈوں کا آگے رستہ کاٹنا ‎ ‎ پھر ٹھہر کر اپنا پہلو چاٹنا

بھوک کی شدت سے ہو کے بے قرار ‎ ‎ دوڑتے تھے جانور دیوانہ وار

بندروں کا دور سے لکارنا اور ناگوں کا کہیں پکارنا

بولتا تھا بوم اس انداز سے

بڑھتی تھیں ویرانیاں آواز سے

(نقدرواں،صفحہ۹۵)

رات کے وقت تاریک جنگل کا عالم ہوتا ہے۔اس کی صحیح تصویر رواں نے کھینچ دی ہے۔ایسی سچی تصویریں اردو شاعری میں خاص نظر آتی ہیں۔ ہر ایک تصویر صداقت اور اصلیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔اوپر کے اشعار میں رواں کا بے حد عمیق مشاہدہ ظاہر ہوتا ہے۔ گیڈر کا راستہ اور پھر ٹھر کر اپنا پہلو چاٹنا نہایت ہی سچا مشاہدہ ہے۔اسی طرح لومڑی کا ڈر کر بھاگنا اور تھوڑی دور پر جا کر ٹھہرنا لومڑی کی عادت کی صحیح عکاسی ہے۔رواں کی منظر نگاری کی نمایاں خصوصیت ان کا عمیق مطالعہ ہے۔اس کا ثبوت انھوں نے اپنی نظم ''تتلی'' میں یاد کیا ہے اس کے چند اشعار میں مناظر قدرت درج ذیل ہیں۔

آ ٹھہر جا پیاری تتلی شاخِ گل پر کوئی دم — تیرے ان رنگیں پروں کے ہیں بہت مشتاق ہم

اُڑتا پھرتا ہے ہوا پر ساغرِ زریں کوئی — کر رہی ہے سیر یا معشوقہ رنگیں کوئی

بن کے یوسف حسن خود آیا ہے بازار میں — پڑگئی جان تازہ یا گل و گلزار میں

جسم ہلکا ساترا، بازو سبک اور پرسبک — آتش گل کے ہیں یا شعلے سک، جگر سک

کالی، پیلی، عنابی، گلابی، سبز، لال

تو نظر جس رنگ میں آتی ہے دلکش ہے کمال

(لمحات نور،۱۷۸)

رواں نے مذکورہ اشعار میں تتلی کی شکل وشباہت اور رنگ و رُوپ کو نہایت صحیح انداز میں پیش کیا ہے یہی کامیاب منظر نگاری کی دلیل ہے۔

سیماب اکبرآبادی نے بھی مناظر قدرت کی حسین تصویریں کھینچی ہیں۔انھوں نے اپنی بعض نظموں میں قدرت کے مختلف رنگ کو استعمال کیا ہے۔اس حوالے اس ان کی ایک نظم ''صبح صادق'' سے یہ پتا چلتا ہے جس کے چند شعار ملاحظہ ہو۔

مجھے کیف بادہ صُبح میں، تجھے لطف خواب سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں، جو بہار میری نظر میں ہے
میری بزم سحرآ، تجھے میں نہ دکھاؤں وہ آئینہ
جوت جلیوں سے گھرا ہوا، میری چشم جلوہ گر میں ہے
یہی لمحہ صبح ظہور ہے، یہی لحظہ مشرق نور ہے
عجب انتظام سرور ہے، کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے

(کارامروز،صفحہ۱۵۹)

سیماب اکبرآبادی کی نظر میں صبح ایسی ہی نشہ انگیز ہے جیسی شراب، اس لیے انھوں نے بادہ صبح'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔بہرحال اُن کو بادہ صبح میں ایک خاص قسم کا کیف ملتا ہے۔اور اسی صبح کے جلوے کو بھی پیش کرتے ہیں۔یہ صبح کبھی دل میں سرور پیدا کرتی ہے اور کبھی سر میں،الغرض سیماب اکبرآبادی نے ان اشعار میں قدرت سے مسرت اندوزی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

دور جدید کے شعرا میں فراق گورکھپوری نے فطرت کی طرف کافی توجہ کی ہے۔انھوں نے اپنی

غزلوں میں فطرت کی جھلکیاں پیش کی ہیں اور نظموں میں بھی مناظر قدرت کے جلوے دکھائے ہیں۔اِن کی منظر نگاری کی خصوصیت بھی زیادہ عمیق اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔فراق نے انھیں مناظر کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔جن کو فراق نے بذات خود دیکھا ہے۔اس لئے ان کی منظر نگاری کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ان کی نظم ''آدھی رات'' کو اس کے بیان کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پر چھائیں
زمین سے نامہ وانجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گمشدگی
اک ایک کر کے نسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں۔جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہی پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جمائیاں آئیں
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
حنا کی ٹیٹوں میں نرم سرسراہٹ سی
لٹوں میں رات کی دیوی کی تھرتھراہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چلی ہوگی

(نظم آدھی رات، صفحہ ۴۵)

مذکورہ اشعار میں فراق نے آدھی رات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔آپ نے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو رات کی خاموشی کی صیح تصویر اُتارتے ہیں۔سیاہ پیڑ کا ٹکڑا اور ظلمت کی شب کی عکاسی کی ہے۔''اتھاہ گم شدگی'' سے فطرت کی خاموشی واضح ہو جاتی ہے۔اور یہ رات ہندوستان ہی کی رات ہے اور اس رات میں جھینگر کی سرسراہٹ محسوس کی جا سکتی ہے اور ندی میں کمدنی کے پھول کی شگفتگی دیکھی جا سکتی ہے اور یہ سارے کے سارے ہندوستان کے حسین مناظر ہیں جن سے ہم کو واقفیت حاصل ہے۔

فراق کی منظر نگاری جذبات عشق کی آمیزش سے خالی نہیں ہے۔فراق نے اظہار عشق کے سلسلے میں پہلے سے ہی مناظر قدرت کا بیان کیا ہے۔پھر یہ بتایا ہے کہ اِن حسین مناظر میں محبوب کا وصل کس قدر لطف دیتا ہے۔اس بارے میں اِن کی ایک ''نظم پرچھائیاں'' کا تیسرا بند ملاحظہ ہو۔

یہ رات، چھلتی ہواؤں کی سوندھی سوندھی مہک
یہ کھیت کرتی ہوئی چاندنی کی نرم دمک
سگندھ رات کی رانی کی جب مچلتی ہے
فضا میں روح طرب کروٹیں بدلتی ہے
یہ روپ سر سے قدم تک حسین جیسے گناہ
یہ عارضوں کی دمک، یہ فون چشم سیاہ
یہ دھج نہ دے جو اجنتا کی صنعتوں کو پناہ
یہ سینہ پڑ ہی گئی دیو لوک کی بھی نگاہ

یہ سر زمین ہے آکاش کی پرستش گاہ

اُتاتے ہیں تری آرتی ستارہ و ماہ

سجل بدن کی بیان کی طرح ہو کیفیت

سرسوتی کے بجائے ہوئے ستار کی گت

جمال یار تیرے گلستان کی رَہ رَہ کے

جبین ناز تری کہکشاں کی رَہ رَہ کے

دلوں میں آئینہ در آئینہ سُہانی جھلک

(گل نغمہ، صفحہ ۲۴۹، ۲۵۰)

مذکورہ بند میں صرف رات کی منظر نگاری ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ جمال یار کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔اِن حسین مناظر میں محبوب کی یاد اور بھی زیادہ ستاتی ہے۔اس لیے ہواؤں کی مہک اور چاندنی کے دمک کے درمیان کو ''فونِ چشم سیاہ'' یاد آ رہا ہے۔

حفیظ جالندھری نے بھی منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔اِن کی مختلف نظموں میں مناظر قدرت کے جلوئے نظر آتے ہیں۔مگر اکثر یہ جلوے صاف اور روشن ہے۔ان کے نظموں کو پڑھنے کے بعد منظر کشی کی صیح تصویر نظر آتا ہے۔ان کی نظم ''برسات'' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

آئی ہے برسات چھائی ہے برسات

کوہ و دمن پر دشت و چمن پر

شہر اور بن پر

بے ساختہ پن

رنگیں جوانی سبز اور دھائی

گل پوش جلوے مد ہوش نغمے

دل کش فضائیں

ٹھنڈی ہوائیں

(نظم برسات، صفحہ ۱۳۳)

حفیظ کے یہ سارے بند برسات کی مصوری مکمل طور سے ادا کرتی ہے۔اس میں حفیظ نے مصوری سے زیادہ موسیقی پر زور دیا ہے۔اس نظم میں حسین الفاظ ہیں جو ایک دلکش نغمہ پیدا کرتے ہیں مگر وہ کہیں کہیں جگہ پر برسات کی مصوری کرنے سے قاصر ہیں۔عام طور پر ان کی منظر نگاری پر موسیقی غالب آجاتی ہے۔اس موسیقی کے پردے سے کہیں کہیں منظر نگاری کی جھلک اُٹھتی ہے۔بہر حال حفیظ جالندھری نے اپنی نظموں میں منظر نگاری پر زور دیا ہے۔اس بارے میں اِن کی ایک اہم نظم ہے جو انھوں نے کشمیر کے بارے میں کہی ہے۔اس نظم کے کچھ بند بھی ملاحظہ ہوں۔

چارسو پہرے کھڑے ہیں ساکت وصامت خموش تاج نوران کے سروں پر،جسم ان کے سبز پوش

ایک ہی قانون قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش کچھ نہیں خر خدمت کشمیر کہاروں کو ہوش

روکتے ہیں راستہ ہر دشمن بے پیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کی اونچائیاں، برفاب کی گہرائیاں رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پردائیاں

سبز قالینوں پہ دیوار کی بزم آرائیاں بنتے نئے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑنا ر تاریکی و تنویر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(تلخابہ شریں، صفحہ ۱۰)

آپ کی منظر نگاری میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ صرف مناظر قدرت کے نقشے ہی نہیں کھینچتے ہیں بلکہ مناظر قدرت کی مدد سے خود کو بادہ نوشی کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔اس طرح سے حفیظ جالندھری کی منظر نگاری پوری طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔اس حوالے سے اُن کی ایک نظم ''چاند کی سیر'' کے چند بند یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

عطر بیز لالہ زار نغمہ ریز جا بجا

حشر خیز آبشار

کیف موجِ بقرار چاندنی میں کوہسار

تھا بہار در بہار

وہ کنار آب کی محفلیں شراب کی

مستیاں شباب کی

(نغمہ زار، حفیظ جالندھری، صفحہ ۲۴،۲۵)

مذکورہ بندوں کے پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر چاندنی کی سیر کر رہا ہے۔اور یہ بھی محسوس

ہورہا ہے کہ چاندنی رات میں شاعر نے محفل شراب بھی منعقد کی ہے یہی منظر نگاری کا اصل وثوق ہے کہ جس کو حفیظ نے اپنی نظموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

منظر نگاری کے سلسلے میں اثر لکھنوی کا نام بھی اہم ہے۔اثر لکھنوی نے بھی مناظر قدرت کا مشاہدہ براہ راست کیا ہے۔اس کی وجہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمت تھے پنشن پانے کے بعد وادی کشمیر میں وزیر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا ہے۔اس لیے سرینگر میں ان کا قیام مستقل طور سے ہوگیا۔اثر لکھنوی نے اپنے اس قیام سے بہت فائدہ اُٹھایا اور مناظر قدرت کا عمیق مشاہدہ کیا ہے۔انھوں نے اس دور کی ساری نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔اور''عروس فطرت'' کے عنوان سے شائع ہوگئی ہیں۔''عروس فطرت'' کی نظموں کا تعلق مناظر قدرت سے ہے۔انھوں نے کشمیر کے مختلف مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے

اور اِن مناظر کی مصورانہ منظر کشی کی ہے۔اِن کی ایک نظم ''پامپور کے عنوان سے ہے۔اس نظم کو لکھنے سے پہلے اثر نے جو نوٹ لکھا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مناظر قدرت کو کن گہری نظروں سے دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں:

> '' پامپور سرینگر سے نو میل کے فاصلے پر جانب شمالی وہ خطّہ' کہ جہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔چاندنی رات میں کوسوں پھیلے ہوئے۔ زعفران زار کی ایک سیر ایک مسحور کن منظر پیش کرتی اور کشمیر' کی رعنائیوں میں چار چاند لگا دیتی ہے۔عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زعفران کا پھول سُرخ وار ہوتا ہے یہ صحیح نہیں، پھول کا رنگ ہلکا اودا ہوتا ہے اس کے اندر

تین سُرخ ڈورے ہوتے ہیں۔یہی زعفران ہے، پھول نہایت نفیس‘
نازک‘ تتلی‘ یا عورتوں کے کانوں کے خوبصورت بندوں سے ملتے جلتے ہیں
کاسنی رنگ کی بنا پر میں نے زعفران کے پھولوں کے کرشن جی کی ہنسی
سے تعبیر کیا ہے۔(گو حقیقت کے خلاف ہی) کہ زعفران کو کھیت دیکھ
کے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔‘‘

(عروس فطرت‘ اثر لکھنوی‘ صفحہ۴۱،۴۲)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اثر لکھنوی نے زعفران کے پھولوں کو بہت ہی غور سے دیکھا ہے اور اِن کی خصوصیت پر نظر ڈالی ہے۔اس لئے اثر لکھنوی نے جب زعفران زار پر نظم کہی ہے تو اس میں حقیقت کے رنگ کو بھی شامل کر دیا ہے۔قدرتی مناظر سے اِن کی اصل نظم ملاحظہ ہو۔

پہلا منظر:

مطربِ خوش نوا سنا‘ نغمے کچھ ایسی شان کے
چھٹکی ہو جیسے چاندنی کھیت میں زعفران کے
ہلکی آہٹ اس میں ہیں دوڑے حسین سُرخ سُرخ
دانے الگ الگ رہیں جیسے وحدن میں تان کے
ان کی ادائے دل ربا پا نہ سکیں گے حشر تک
رہنے دو آسمان پر تاروں کو آسمان کے
شیام کے رنگ روپ میں رادھا برا جنے لگیں
شیام کو آ گئی ہنسی پھول تھے زعفران کے
اور کہاں یہ حکمتیں اتنی لطافتوں کے ساتھ
پھول نہیں صحیفے ہیں دید کے یا پران کے
وہ جو بھری بھری کلی منھ جو ادھر کو پھیرے ہے
بیٹھی ہیں روا ٹھی رادھا جی گوئیوں کو لکھا ان کے

(عردوس فطرت، اثر لکھنوی، صفحہ ۴۴)

دوسرا منظر:

تیر نظر چلایئے شوق سے سینہ تان کے	کھیل نہ جائے جان پر کوئی مان کے
نرگس خود فروش سے کہتی ہیں ان کی شوق خیال	آنکھ ملا کے بات کر مان ہیں ابھی اٹھان کے
اتنے سے وہم پر انھیں دیکھ کے مسکرائے کیوں	غنچوں سے سرگرانیاں صدقے اس آن بان کے

آنکھیں چڑھی چڑھی سے ہیں پلکیں جھکی جھکی سی ہیں
تم نے پی اور ضرورت پی بات گلوں کی مان کے

(عروس فطرس، صفحہ ۴۵)

تیسرا منظر:

چاندی رات، پامپور، سامنے کشت زعفران	چاہیے شرم کچھ اثر، شعر ہیں اس کی شان کی
شاعر اک طرف رہی میری تھی رائے اور	ان سے کہیں حسین بندے سے کسی کے کان کے
ہائیں یہ کیا طلسم ہے اور رت سماں ہے اور	پھول تھے زعفران کے یا اب ہیں ارغوان کے

(عروس فطرت، صفحہ ۴۵)

اس نظم میں شاعرانہ مصوری بھی ہے۔ حسن بیان بھی ہے۔ لطف زبان بھی ہے نازک اور حسین تشبیہات بھی ہیں۔ اس نظم میں زعفران کے پھولوں کو کرشن جی کی ہنسی سے تشبیہ بالکل انوکھی بات ہے۔ اتنا ہی نہیں ہے بلکہ زعفران کے پھولوں کو کان کے بندون سے مشابہ کرنا، ذاتی مشاہدہ کی بین دلیل ہے۔ اثر لکھنوی نے زعفران کے رنگ کو ہلکا بتایا ہے کہ پھولوں میں سُرخ حسین دوڑے ہوتے

ہیں۔ان سارے بیانات کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔اس نے زعفران کے کھیتوں پر نظر جمادی ہے اور اپنے تاثرات کو شعر کا جامعہ پہنا دیا ہے۔اس کی یہ نظم بے حد حسین ہے۔اس نظم میں مشاہدہ اور تخیل دونوں شامل ہیں۔اور دونوں کا استعمال مناسب طریقہ پر ہوا ہے۔منظر نگاری کے ادب میں اس کی یہ نظم ہمیشہ بلند حاصل رہے گا۔

اثر لکھوی نے ایک اور نظم ''کشمیر کی شام کے نظارے'' کہی ہے اس نظم میں آپ نے کشمیر کی شام کے حسین نظارے پیش کیے ہیں۔

کرنوں کے سُنہری وہ اشارے — اور برگ چنار سُرخ سارے
دھوکا جھیلم پہ ہوگیا ہے — سونے کا خمیر اٹھ رہا ہے
ہر موج کا رنگ ارغوانی — پگھلی ہوئی آگ ہے کہ پانی
اک بزم رچی ہوئی ہے ڈل میں — جلتا ہے چراغ ہر کنول میں
جمگھٹ ہے افق پہ بادلوں کا — یہ سرُخ وہ سانولا سلونا
تحلیل ہوا میں ہوتے جانا — اور رنگ بہم سموتے جانا
جلتا پرزہ ہے ہلکا ہلکا — پرکار شفق ہے ہلکا ہلکا

گُہرا کہ غبارہ آتشیں ہے
یا کوئی نگا رِ نازنیں ہے

(کشمیر کے نظارے،صفحہ۱۷)

اثر لکھنوی نے مناظر قدرت کے نقشے ہی نہیں کھینچے ہیں بلکہ ان مناظر سے محفوظ بھی

ہوتے ہیں۔اور ان کے حسن پر اپنا دل بھی نچھاور کر دیا ہے۔یہی اِن کی منظر نگاری کی خصوصیت ہے۔ بہار کشمیر سے لطف اندوزی کا جذبہ اِن کے مندرجہ ذیل اشعار میں موجود ہے۔

سر جوشی نشاط کا سامان ہے آج بھی — رنگینوں کا نام گلستان ہے آج بھی

کشمیر کی زمین ہے فطرت کا میکدہ — مستی بقدرِ لذت عرفان ہے آج بھی

اس سرزمین کے ذروں کے تابندگی نہ پوچھ — خورشید ایک دیدہ حیران ہے آج بھی

ایک ایک پھول تابش انوارحسن سے — صبح بہار خلد پہ خندان ہے آج بھی

طوبیٰ کہ جس کے سائے میں آباد ہے بہشت — وہ سائے پر چنار کے قربان ہے آج بھی

جیسے ہو ایک رات کی سجائی ہوئی دلہن
اس طرز سے نسیم خرامان ہے آج بھی

(عروس فطرت صفحہ ۱۷، ۱۸)

آخر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دکن کے شعرانے زیادہ تر مناظر کشی کے واقعات کو واضح اور صاف طور پر پیش کیا ہے۔اور ساتھ ہی دکن کے شعرانے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے بیان میں تصنع وتکلف اور آدرد کو دخل نہیں کیا ہے اور نہ ہی اپنی شاعری میں بے قافیہ پیمائی سے کام لیا ہے وہ اکثر اپنی شاعری میں حسُن تعلیل استعمال کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے منظریہ شاعری کے حسُن میں اضافہ ہوگیا ہے۔دکن کے جتنے بھی شاعر ہے۔ان کی شاعری میں یہ بات بھی ہے انھوں نے اپنی شاعری میں مشاہدات سے کام لیا ہے اور کہیں جگہ پر مناظر قدرت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور انھیں کو نظم کیا ہے اس بارے میں سلام سندیلوی اپنی کتاب ''اردو شاعری میں منظر نگاری میں'' لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں، محمد قلی قطب شاہ کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ان شعرااور مناظر قدرت کے درمیان کسی قسم کا خلا نہیں ہے بلکہ ان شعرا نے مناظر قدرت میں کھو جانے کی کافی کوشش کی ہے کچھ شعراایسے بھی ہیں جنھوں نے مناظر قدرت کواپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے مگر انھوں نے ہندوستان مناظر کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ان شعراء نے اپنی ذاتی تجربہ کی بنا پر ہندوستان کے مناظر قدرت ،کوصحت اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ملاوجہی اور نصرتی کے یہاں ہندوستان ہی کے مناظر قدرت ،کاعکس موجود ہے۔اُن شعرا نے بھی منظر نگاری میں کامیابی حاصل کی ہے خاص طور سے نصرتی کے نام کومنظر نگاری کے ادب سے علحیدہ نہیں کیا جاسکتا ہے کچھ دکنی شعرااس قسم کے بھی ہیں جنھوں نے دیگر ممالک کے منظر نگاری کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے غواصی،صنعتی،ابن نشاطی اور فائز دکنی وغیرہ کا نام اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہے ان شعرا نے اپنی تخیل بنا پر دیگر مما لک کے مناظر کونظم کیا ہے ان کی منظر نگاری قیاسی اور فرضی ہے۔''

فطرت کی عکاسی

فطرت ایک جامع لفظ ہے جس کے تہہ در تہہ معانی اور مفاہیم ہیں یہ لفظ ہماری نظروں کے سامنے

پھیلی ہوئی کائنات کے ان تمام خارجی مناظر ومظاہر کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو ہماری نگاہوں کی تابنا کی ،ذہن کو روشنی اور دل و دماغ کو تازگی عطا کرتے ہیں۔ ویسے کائنات کے مناظر کا شمار اور احاطہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں پھر بھی جو لوگ فطرت کو ایک طاقت ایک توانائی یا ایک خارجی قوت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا مطالعہ اتنا ضروری ہے جتنا انسان کو اپنی داخلی دنیا کے سمجھنے کے لئے لازمی ہے۔ظاہری دنیا یا کائنات تمام مظاہر کا نام ہے جن کو آدمی دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے یہ مظاہر دیکھنے والے کو اپنی طرف کشش کے ساتھ کھینچتے ہیں۔آدمی متاثر ہوجاتا ہے مظاہر کی رنگارنگی میں کھوجاتا ہے اور اپنے لئے ان کے اندر ایک بے مثال سکون ایک پائیدار وابستگی اور تعلق پالیتا ہے۔فطرت کا مطالعہ انسان کے لئے بے حد ضروری ہے یہ مطالعہ انسان کو اس حقیقت کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا دنیا کی تخلیق کے پیچھے کارفرما ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کی نہ ابتدا ہے اور جس کی نہ کوئی انتہا۔ مناظر کی دو نوعتیں دیکھنے کو ملتی ہیں ایک جس کو زمانی کہتے ہیں اور دوسری جس کو مکانی کہتے ہیں ۔ یہ مناظر بھی دو طرح کے ہوسکتے ہیں ایک جو فطری اور مصنوعی پہلے ہم فطری مناظر پر بحث کریں تاکہ پتہ چلے گا کہ فطرت کا معنی و مفہوم جو خود تشریح طلب ہے یہ لفظ اصل میں کس زبان کا ہے اس بارے میں مرتضٰی مطہری لکھتے ہیں۔

’’ عربی لفظ فطرت کا مادہ فطر ہے جس کی دو شکلیں ہیں ایک کو’’ فَطَر‘‘
جس کے معنی پھاڑنا اور دوسرے فطَرۃً کے معنی ہیں بنانا یا تخلیق کرنا‘‘

(کتاب۔فطرت،صفحہ۱۹،۲۰)

جو لفظ’’ فطرت‘‘ استعمال ہوا ہے فطرت کے لفظ کو قرآن نے سب سے پہلی مرتبہ انسان کے لئے

استعمال کیا ہیں آیت اللہ مرتضٰی مطہری لکھتے ہیں:

''جو لفظ قرآن حکیم نے پہلی بار استعمال کیا ہے۔ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے ۔فطرۃ اللہ علیھا ،(روم۲۱۰) مادہ ''فطر''' (فطرت)'' قرآن میں متعدد بار یہ لفظ استعمال ہوا ہے کبھی'' فطرھن' (انبیاء۵۶) کبھی فاطرالسموات ولارض (انعام۱۴) اور دیگر پانچ آیات کبھی الفطرت (الفطار) اور کبھی ''منفطر بہ'' (مزمل۱۸) ہر مقام پر اس لفظ کے معنی ہیں ابداع اور خلق بلکہ خلق بھی ابداع کے معنی میں ہی ہے۔ابداع کے معنی کسی سابقہ کو پیش نظر رکھے بغیر پیدا کرنے کے ہیں''

(کتاب ۔فطرت،صفحہ۲۰)

جس کو ہم فطرت کہتے ہیں۔قرآن میں یہی لفظ ''فطرت'' انسان اور دین کے ساتھ رابطے کے بارے میں آیا ہے۔''فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا'' ہم نے انسان کو خلقت دی ہے اور انسان ایک خاص انداز سے پیدا ہوا ہے اس بارے میں ابن اثیر نے یہ حدیث نقل کر کے ''فطرت کا لفظ کے معنی یوں استعمال کیا ہیں کہ۔

''الفطر الابتداء ولاختراع (فطر) یعنی ابتداء واختراع یعنی خلقت ابتدائی کے جسے ایجاد کہتے ہیں اس سے مراد ایسی خلقت جس میں کسی کی تقلید نہ کی گئی ہو۔

(فطرت،صفحہ۲۰)

لفظ ''فطرت''، یعنی خلقت کی ایک خاص حالت اور خاص نوعیت کے معنی و مفہوم ہوتے ہیں

مزید لکھتے ہیں:

'یعنی انسان ایک خاص طرح کی شرشت اور طبیعت کے ساتھ پیدا کیا گیا

ہے''

(فطرت، صفحہ ۲۰)

دراصل فطرت کو چاہنا اور فطرت کو پسند کرنا بنی نوع انسان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ انسان خود فطرت کا ایک جزوَ بن گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو تخلیقات فطرت میں ہزاروں اشیاء بھی شامل ہیں۔ اُن میں سے چند اشیاء ایسے بھی ہیں جو ہماری نگاہوں سے دور ہیں لیکن انسان کے فطرت سے متعلق جتنی بھی اشیاء جو نگاہوں سے دور ہیں انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں اور انسان کی فکر پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ہر دور میں انسان نے فطرت کے مختلف اثرات قبول کئے ہیں اس بارے میں سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''جب انسان نے پہلی بار دنیا میں آنکھیں کھولیں۔تو فطرت کو دیکھ کر اس کے دل میں حیرت واستعجاب کے جذبات بیدار ہوئے۔اس نے فلک بوس کے علاوہ بھی خوبصورت پہاڑوں کے سلسلے دیکھے۔اس کی نظر بحر بیکراں کی موجوں پر پڑی۔اس نے سورج، چاند اور ستاروں کی آنکھ مچولی کا جائزہ لیا اور ہواؤں کا رقص اور بادلوں کی مستی کا مشاہدہ کیا ہے ان تمام اشیاء نے اس کو مست اور مستجب کردیا مگر انسان ابھی فطرت کے

ایک ہی نظارہ میں تھا، اور کچھ عرصے بعد اس کی نگاہوں نے فطرت، کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیا اس کی نظر فطرت کے غضبناک چہرے پر بھی پڑی۔اس نے بادل، کی گرج بجلی، کی کڑک آندھی، کا شور سمندر کا طوفان اور دریا کا سیلاب بھی دیکھا تھا۔اس لئے خوف زدہ، ہوکر اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور آنکھیں بند کر لیں اس طرح اس کے دل میں خوف کا جذبہ پیدا ہوا مگر طوفان کے بعد اس نے فطرت کے خط وخال، کا دوبارہ جائیزہ لیا۔تو اس میں بھی حسن نظر آیا اس نے نیلے آسمان میں ایک کشش محسوس کی وہ شفق کی مسکراہٹ سے محفوظ ہوا ہے چاند کے حسن نے اس کا دل چھین لیا اور پھولوں کی نکہت نے اس کو مست کر دیا۔''

(اردو شاعری میں منظر نگاری، صفحہ ۵۲، ۵۳)

دنیا میں مختلف طرح کے لوگ رہتے ہیں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن لوگوں کا فطرت کے بارے میں کیا نظریہ تھا۔اس حوالے سے سب سے پہلے ہم ظاہر فطرت کی پوجا دیوتاؤں کی صورت میں کرتے تھے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں فطرت (نیچر) کا نام بھی موجود تھا۔اس بارے میں داؤد رہبر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''اہل چین کے شعور میں کائنات کی بساط پر انسان مسند نشین نہیں۔ بلکہ بیچ اور بیچ ہے، سب سے اوپر آسمان بابا، اس کے بعد'' (کہستان، اشجار، بادل، بارش، جھیل، دریا، ہوا، پرندہ)اور اسفل چوپایہ، درندہ اور انسان

۔چین کی مصوری میں مراتب کا یہ نظام برابر جھلکتا ہے''

(کلچر کے روحانی عناصر،صفحہ۵۹)

یونان والوں نے بھی مظاہر قدرت کو معبود بنالیا وہ ان دیکھے خدا کی عبادت کرتے تھے اور مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے اس حوالے سے داود رہبر لکھتے ہیں:

''ہندوں کے احساس میں فطرت (نیچر) کا نام ان کے ہاں مایا ہیا ور مایا ہے فریب اور صرف فریب''

(کلچر کے روحانی عناصر،صفحہ۵۵)

اِن مذاہب بندوں کے تین دیوتا ہیں آگ ،سورج اور ہوا۔ان سب کا مقام بھی علی الترتیب یعنی زمین،فضا،اور آسمان ہے اس حوالے سرفراز حسین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''رگ وید کی دُعاؤں کرنے سے معلوم ہوگا کہ مظاہر فطرت کی پرستش نہ بطور متعدد خداؤں کے کرتے تھے بلکہ بطور ایک خدائے برتر کے اجزاء ہونے کے قدیم آریہ، لوگ نے اپنی ابتدائی ضرورتوں کو پور کرنے والا ظاہر میں سورج اور آگ وغیرہ کو پایا،اور انہی کو پوجنا شروع کیا۔

(ہندو دھرم اور اسلام،صفحہ۱۱)

علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب ''روایات تمدن قدیم'' میں لکھتے ہیں:

'' چینیوں کا فطری مناظر سے عشق اُن کے ادب میں شاعری فلسفے اور مصوری میں نفوذ کر گیا۔انہوں نے قدرتی مناظر، پہاڑوں ،جھیلوں

اور پھولوں کی بے مثال تصویریں کھینچیں ۔اُن کی اصطلاح میں منظر کشی کا نام
پہاڑ اور پانی تھا،اُن کے قدرتی مناظر میں انسان کوحقیر وصغیر دکھایا گیا ہے‘‘

(روایات تمدن قدیم،صفحہ ۲۷۱)

ایک جگہ پر قدیم جاپانی شاعری کے حوالے سے سعادت سید لکھتے ہیں:

’’ قدیم جاپانی شاعری کی ایک کتاب ’’مانیوشو‘‘ ہے، یہ آٹھویں صدی میں مرتب ہوئی تھی ۔اس میں زندگی کے مناظر کی تعریف میں مختصر نظموں کے علاوہ ایک نظم ’’جنت کے دریا کی موج‘‘ میں بھی ہے‘‘

(اردو قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ،صفحہ ۱۱)

اُس روح عظیم جس کی جلوہ گریاں کائنات یعنی زمین وسما میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں ہمیں وہ حسِ بصارت کے ذریعے ہی سے تعارف کرواتی ہیں بنی نوع انسان نے ان جلووں کو مختلف ناموں اور مختلف اندازِ فکر کو اپناتے ہوئے اپنی قوت استعداد ذہنی سے ان کی تشریح وتعبیر شروع کر دی۔اس حوالے سے ڈاکٹر مظفر حسن لکھتے ہیں:

’’ڈیوڈ نولز (David Knowles) نے کہا ہے کہ لفظ نیچر یا فطرت کو ایک قانون اور نظام کے معنی میں سب سے پہلے ارسطو نے رواج اور ارسطو نے ہی خدا اور نیچر کے الفاظ ایک ساتھ استعمال کئے گویا یہ دونوں مترادفات ہوں‘‘۔

(سر سید اور حالی کا نظریہ فطرت،صفحہ ۱۳۲)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''ارسطو کے نزدیک اعلیٰ ترین ،حقیقت وجود مطلق (Pure Being)
وجود مطلق، سب سے پہلے اپنے آپ کو دوشکلوں میں ظاہر کرتا ہے ایک
ماہیت (Essence) دوسری(Substance) ارسطو کے نزدیک اس
کی دوقسمیں ہیں ایک مادہ (Meteria prima) جس سے پوری
کائنات بنی دوسرا مادہ ثانوی جس کو انگریزی میں Metrria
(Seconda) جس سے انفرادی مظاہر بنے ارسطو کہتا ہے کہ کائنات کی
ہر چیز انہی دو اصولوں سے مل کر بنتی ہے۔

(سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت،صفحہ ۱۳۰)

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فطرت اور انسان کا رشتہ بھی کسی حد تک واضح ہو گیا اور ارسطو کی یہ بات بھی سامنے آ گئی۔اس دنیا کی ساری زمین اصل میں فطرت کا ہی ایک بڑا حصہ ہے اور آج سے لاکھوں سال سے پہلے اس کی ایک الگ ہی حیثیت قائم ہوگئی۔جہاں تک ان کا تعلق زمین اور فطرت کے ازل سے مربوط منسلک ہونے کے لئے تاریخ کے شواہد موجود ہیں یہ رشتہ ہمیشہ سے مضبوط مستحکم اور متحرک رہا ہے غور سے دیکھا جائے تو زمین آج بھی فطرت کے ایک تابندے سیارے بھی سورج کے گردش کر رہی ہے اور یہ گردش تب تک قائم رہے گا جب تک اس دنیا کا وجود نظام قائم ہے اس طرح سے مختلف ادوار میں فطرت کو مختلف معانی دیتے ہیں قدیم زمانے کے روایت میں فطرت کے معنی ایک ایسا منظّم اور بالترتیب کائنات کا تھا جہاں اس کائنات کا بھی ذرہ ذرہ اپنے خانوں میں مقررہ دائرہ میں

قانون کا پابند تھا لہذا قدیم زمانوں سے کسی نے فطرت کو فن کا نمونہ گردانا تو کسی نے کہا۔اس بارے میں ظفر حسن کا خیال ہے۔

''فطرت ایک آہستہ رو برور تصویر رکھتی ہے''

(سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت،صفحہ ۵۵)

ان تمام مناظر فطری سے مراد جیسے سمندر ، ریگستان، جزیرے ،آندھیاں ، پہاڑ ،جنگل ،طوفان، بارش ،برف، موسم ، نظارے ،دریا،زلزلے ،وغیرہ مناظر فطری کے بارے میں محمد سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں کہ

''ان مناظر کو بنانے میں انسان کی خواہش یا کوشش کو کوئی دخل نہیں ہوتا ،نہ انھیں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بس موجود ہوتے ہیں،یا برپا ہو جاتے ہیں۔سہولت کے لیے آپ کو فطرت کی گزاری کہہ سکتے ہیں۔مصنوعی مناظر میں باغ ،نہریں''(جو آب پاشی کی غرض سے بنائی گئی ہوں)''پل عمارتیں قلعے، مینار،عبادت گاہیں وغیرہ شامل ہیں۔مناظر کے لیے کچھ نہ کچھ وسعت لازمی ہے۔(اسی لیے کسی فریاد لباس کا بیان منظر کے ذیل میں نہیں آتا)اس کے علاوہ تمام معاملات جو افراد نے مل کر کسی خاص مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر منعقد کیے ہوں مثلاً جشن ،مذہبی تہوار ،میلے ٹھیلے، برات ،جلوس وغیرہ۔یہ منظر خوش نما بھی ہو سکتے ہیں۔، ہیجان خیز اور بھیانک بھی جیسے''ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔بڑا ڈراؤنا

منظر تھا۔مصنوعی مناظر خواہ کیسے بھی ہوں انسانی عمل دخل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔''

(سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت،صفحہ ۱۵۲)

احمد شوقی قدوائی کا نام بھی منظریہ نظموں کے سلسلہ میں غیر فانی رہے گا۔انھوں نے اس انداز سے مختلف فطرت کا بیان اپنی نظموں میں کیا ہے۔جس کا نقشہ ہمارے ذہن میں کھینچ جاتا ہے۔مثلاً اِن کی ایک نظم ''چڑیاں'' کو پیش کیا جاتا ہے۔

چڑیوں کا اِدھر اُدھر سے آنا — چھوٹے چھوٹے پھلوں کا کھانا
کچھ سبز ہیں جن کے لال سر ہیں — کچھ زرد،سنہری جن کے پر ہیں
کچھ جن میں سفیدی اور سیاہی — کچھ جن کے سروں پہ تاج شاہی
کچھ جن کے زمردیں ہیں پوٹے — نقطے پوٹوں پہ چھوٹے چھوٹے

پانی پہ اِدھر اُدھر نہا کر
بیٹھیں شاخوں پہ پُر پھُلا کر

(لمعات نور،صفحہ ۱۸۰)

شوق قدائی نے واقعی یہاں ایک مصورانہ کام کیا ہے۔انھوں نے نہایت ہی سادہ اور سلیس الفاظ میں چڑیوں کی شکل اور ان کی خصلت کی تصویراُتار دی ہے۔اس قسم کی مصوری ہم کو اس کی ایک نظم ''تتلی میں بھی ملتی ہے۔

تتلی ہے چمن میں اک رنگیلی — پیاری ،چڑیاں نئی نویلی

چلتی پھرتی چمن میں ہر سو — اُڑتی ہوئی پہونچی تالب ِ جو

چپہ چپہ' چمن کا پا مال — مانند شراء و برق تم مثال

منظورِ نظر کلی کلی ہے — ہر اک روش پہ بیک لی ہے

سبزے پہ کبھی نہال پر ہے — گل پر کبھی شاخ پر نظر ہے

قابو میں نہیں جو قلبِ مضطر

یکجا پہ نہیں قرار دم بھر

(لمعات نور، صفحہ ۱۸۱)

شوق قدوائی نے اس نظم میں مصورانہ شاعری کے کمالات دکھائے ہیں۔اس لیے پروفیسر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے۔

''شوق کے بیانات میں عمیق اور گہرائی پائی جاتی ہے۔''

(جدید اردو شاعری، صفحہ ۱۷۲)

فطرت کے مصوارنہ بیان کی مثالیں اقبال کی بھی نظموں میں ملتی ہیں۔اس قسم کی مثالیں ہم کو ان کے ابتدائی دور میں نظر آتی ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں۔

وہ اس دور میں وہ مغرب کے فطرت پرست شعرا کے زیر اثر مناظر ومظاہر خارجی کی مصوری کرتے ہیں اور ان کی اجمالی کیفیتوں کو بیان بھی کرتے ہیں۔''

(مقالات اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحہ ۵،۶)

مگر جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں فطرت کے حُسن سے دور ہوتے جاتے ہیں اگر چہ اقبال کے یہاں بعد کے دور میں بھی منظر نگاری کی مثالیں ملتی ہیں۔مگر اس دور میں فطرت کا بیان ضمنی رہ گیا ہے۔کیونکہ بعد میں اقبال فلسفی شاعر بن گئے۔اسلئے انھوں نے فطرت کو اپنے فلسفیانہ خیالات کے تحریر کے لیے استعمال کیا ہے۔فطرت اقبال کے یہاں محض ایک نقطہ بن گئی ، جہاں سے انھوں نے فطرت کو اپنے مقاصد کے لئے مغلوب کر لیا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

> ''اقبال کی یہاں فطرت کہنے سے اعتنا کی کئی صورتیں ملتی ہیں۔مگر اقبال کو شاعر فطرت کہنے میں پھر بھی خاصا مائل ہوتا ہے۔فطرت کی رعنائیوں اور دل آویزیوں کی کوشش تو بالکل ایک قدرتی شے ہے۔اور اقبال کے کلام کے دور اول میں رعنائے فطرت سے راز و نیاز کے بھی کئی پہلو اور کئی روپ مل جاتے ہیں۔مگر اقبال کی ''انائے کل'' اور ذوق تسخیر کی ہمہ گیری رفتہ رفتہ اس قدرتی پذیر ہوتی جاتی ہے۔کہ اقبال کو شیدائے فطرت سمجھنے کے بجائے حریف فطرت کو جی چاہتا ہے۔''
>
> (مقامات اقبال،صفحہ۳۲،۳۳)

اقبال کے یہاں خالص منظر نگاری کی مثالیں موجود ہیں۔اور کچھ نظموں میں مصورانہ کی جھلک بھی موجود ہے۔ایسی مصوری ہم کو اِن کی نظم ''شام میں ملتی ہے یہ نظم درائے نیکر(ہائیڈرل برگ) کے کنارے پر کہی گئی ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی

وادی کے نوافروش خاموش کُہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بے ہوش ہوگئی ہے آغوش ہیں شب کے سوگئی ہے

تاروں کا خاموشی کا رواں ہے یہ قافلہ بے دراواں ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت ودریا قدرت ہے مراقبہ میں گویا

اے دل تو بھی خموشی ہوجا

آغوش میں غم کو لے کے سوجا

(کلیات اقبال،صفحہ۱۰۹)

فطرت کے ساتھ اقبال نے اپنا رشتہ ذہنی طور پر اس قدر مستحکم کیا تھا کہ ان کے کلام میں مختلف مقامات پرفطرت اپنے مظاہر سے سکون کی حالت پیدا کرتی ہےفطرت پسندی کے اسباب میں دراصل تو یہ اہم سبب ہے جس کے دو سے ہر ذرے، پتا،شجراور رات دن اللہ کی وحدانیت کے نغمے گاتے ہیں اور یہ اس ذات عالی کے آثار ہیں جو لافانی اور لاشریک ہےفطرت نگاری ایک بڑافن ہےاوراس فن کو اقبال نے اس قدرخوبی کے ساتھ برتا ہے کہ اقبال اردو کے چوٹی کے فطرت نگارشاعروں میں شمار ہوتے ہیں اشفاق حسین ناصر نے اپنے مضمون''اقبال اورفطرت نگاری''میں لکھا ہے:

''وہ فکر و تخیل سے فطرت کے دلاویز،اورشوخ مرقعوں' میں زندگی کی لہر
داڑادیتا ہےاوراس کے ذریعےحسن کے نئے نئے اور دلفریب پیکرتخلیق
کرتا ہے عارضی گل کی تابانی،شاخوں کا آنچل،عروس لالہ کا حسن، چشمہ

کہسار۔مہتاب کی کرن، برگ گل پر شبنم کے گوہر, اور بہتے ہوئے دریا
کی روانی ادبی مصوری کے تخیل ہیں جس سے شاعری کا حسن بڑھتا ہے
شاعر تخلیقی عمل میں یہ تخیل دلکش بنا کر پیش کرتا ہے۔ ادبی مصوری لطیف
تصورات اور جذبی و تخیل کے احساسات سے پروان چڑھتی ہے اور جب
شاعر آرٹ کے ذریعے فطرت سے تعلق پیدا کرتا ہے تو شاعری ادبی
مصوری کے روپ میں ڈھل جاتی ہے اقبال ادبی مصور یا اس لئے ہے کہ
اس کا آرٹ فطرت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔''

(اقبال اور فطرت، صفحہ ۱۶۱)

جب ہم اقبال کے کلام میں فطرت کی مصوری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو بہار اور خزاں میں فطرت کی جو بھی رنگینیاں، دریاؤں، جھیلوں اور ندیوں، نالوں آبشاروں میں جو بھی روانیاں اور سبززاروں اور پھولوں میں جس قدر بوقلمونیاں موجود ہیں وہ نکھر نکھر کے ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔کبھی وہ بہار کے پورے کارواں کا ذکر کرتے ہیں تو دامن کہسار کو باغ اِرم سے متاثر کرتے ہیں رنگا رنگ پھولوں کے نام لے کر ہمارے سامنے رنگ و بو کی ایک مشکبار فضا سامنے لاتے ہیں ندی نالے کا تذکرہ ہوتا ہے تو پانی کا اچھلنا تڑپنا اور پیچ کھا کھا کر نکلنے کا منظر نہایت ہی دل پذیر پیرائے میں پیش کرتے ہیں جیسا کہ ''ساقی نامہ'' کے پہلے بند میں کیا ہے۔شاید اردو کی کسی مثنوی میں بہاریہ تمہید کا رشتہ زندگی کے سامنے ایسے کہیں جڑا نہیں آتا ہے جیسا کہ ان اشعار میں ہے

ہوا خیمہ زن کارواں بہار

اِرم بن گی دامن کہسار

(بال جبرئیل،صفحہ ۱۲۲)

مذکورہ اشعار میں جن پھولوں اور بہار کے کارواں کا نقشہ اقبال نے کھینچا ہے ایک دوسرے موقعہ پر پھولوں کو سنیکڑوں روپ اور ہزاروں پہلو دیکر مصوری اور فطرت نگاری کا کمال دکھاتے ہیں۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پر یاں قطار اندر قطار

اودے اودے ،نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح

اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

(کلیات اقبال،صفحہ ۳۰)

اقبال کا ذہن فطرت سے مسرت اور بصیرت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ حیات اور کائنات کے اسرار ومعارف کی تلاش کی طرف مائل کر دیتا ہے۔فطرت نگاری کے تعلق سے اقبال کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فطرت اور آرٹ کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مربوط کر دیا ہے کہ شاعر چاند کی پرسکون خاموشی ، درخت کی ٹہنیوں کی خاموشی اور کہساروں کے سبزہ زاروں کی خاموشی کا ایسا نظارہ لفظوں کے لباس میں ڈھانپتا ہے کہ فکر وفن حیرت کی انتہا کو چھو جاتی ہے۔

بانگ درا کی فطرت کے اشارات سے بھر پور نظم ''ابر کہسار'' ہے نظم میں شاعر نے کوہسار کے

بادلوں کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ جب سخت گرمی پڑتی ہے تو آسمان پر جو بادل چھا جاتے ہیں وہ نگاہوں کو خشکی اور نمی فراہم کرتے ، پرندوں کو ترنم سکھاتے اور پھولوں کی کلیوں کو ذوق تبسم دے کر ایک دلکش ماحول قائم کرتے ہیں ابر کوہسار کے پہلے بند میں شاعر ابر کے ٹھکانوں کے نام الگ الگ لیتا ہے نشیمن، دامن، مسکن اور بن جیسے الفاظ استعمال میں لا کر شاعر بلندی کے تصورات کا ہمارے ذہنوں میں اُبھارتا ہے۔

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کوہسار ہوں گل پوش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ میرا بحر میرا بن میرا

(بانگ درا، صفحہ ۲۷)

اقبال کی فطرت میں ایک ایک ادا کا رمز شناس اور نکتہ دان ہے۔فطرت اس کے مقاصد کا ایک وسیلہ ہے وہ اس تسخیر میں جس قدر جدوجہد کرتا ہے اسی قدر اپنی شخصیت کی تکمیل کا سامان بہم پہنچا تا ہے۔کائنات اپنی وسعتوں کے اعتبار سے اگرچہ بے پایاں اور بے انتہا ہے لیکن کائنات فطرت اقبال کے خیال میں اس بہت بڑی دولت سے محروم ہے جو انسان کے پاس ہے اور وہ ہے انسان کا ذہنی ادراک اس فعال شخصیت اور اس باشعور ہستی ،فطرت چاہیے انسان کو مٹانے کی قوت رکھتی ہے لیکن وہ اپنی قوت کا شعور نہیں رکھتی ۔اقبال نے اپنے کلام میں متعدد بار اس خیال کو پیش کیا ہے کہ فطرت مجبور محض ہے۔وہ جیسی ہے بس ویسی ہے وہ اپنی طبعیت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔فطرت کے مقابلے میں

انسان کا ذہن مزاحمت کرتا ہے۔انسان اپنی صلاحتوں کو آزماتا ہے بانگ درا میں اس خیال کو اقبال نے مختلف پیرائیوں میں ظاہر کیا ہے۔وہ جہاں فطرت کے زبردست شیدائی لگتے ہیں وہاں وہ فطرت اور انسان کے درمیان تفاوت اور تضاد کو واضح کر دیتا ہے۔اس تضاد کو ظاہر کرنے کے پس منظر میں دراصل اس فلسفے کی تائید وتوثیق کرنا مقصود ہے، جسے اقبال فلسفہ خودی کہتے ہیں۔اقبال اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ فطرت ہم سے آزاد بھی ہے اور وابستہ بھی لیکن ایک چیز انسان میں ایسی ہے جو اس کو فطرت سے علیحدہ کرتی ہے اور وہ اس کا تاثر ہے۔احساسِ ذات اور احساسِ کائنات انسان کے ساتھ وابستہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے فطرت عاری اور کلی طور پر محروم ہے۔انسانی زندگی کی اصلی حقیقت ہے۔

اقبال فرد کو اجتماعی زندگی کی قدروں کا تابع دیکھنا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے تمدن محال ہے۔علامہ کو اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ فرد کی شخصیت اجتماعی ماحول کے بغیر آب وتاب نہیں حاصل کر سکتی اور خودی کی پرورش جو حاصل حیات ہے، جماعت کے وسیع ضابطہ وآئین کے بغیر ممکن نہیں۔فطرت اور مناظر قدرت بھی اپنی جگہ اگرچہ منظّم ومنضبط ہیں لیکن انسان جب نظم وضبط اور اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اس کے اجڑے ہوئے چمن میں بہار کی امید پیدا ہوجاتی ہے۔اقبال نے یہ خیال تمثیلی انداز میں لیکن مناظر فطرت کی نقاشی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔اقبال اپنے آپ کو ایک نظم ''عاشقِ ہر جائی'' میں اضداد قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہے:

مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں ہے تو

ہے تو حکمت آفرین، لیکن تجھے سودا بھی ہے

حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے

پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پرواہ بھی ہے

(بانگ درا، صفحہ ۱۲۲)

فطرت نگاری میں اقبال کا طرز بیان وصفیہ توصیفیہ نہیں بلکہ ایمائی و رمزی ہے وہ منظر کی مقامی ٹھوس جزئیات سے کم لگاؤ رکھتے ہیں بلکہ منظر کے حسن کے مجموعی تاثر کو سامنے رکھ کر خیالی مرقعے تیار کرتے ہیں۔ بال جبرئیل کی ایک نظم ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں اقبال نے قصہ آدم کے ساتھ مناظر کا ایسا سماں پیدا کیا ہے جس سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں پورے قصہ میں مناظر کا ایک حسین سلسلہ ہے۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دے دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ صحرا یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل فرشتوں کی ادائیں

(بال جبریل، صفحہ ۸۱)

آخر میں اقبال اپنے قارئین کو ان مناظر کی سیر کراتے ہیں جو خیال اور تخیل سے تعلق رکھتے

ہیں۔ظاہر ہے یہاں بھی اقبال نے کمال دکھایا ہے۔اس کی بہت واضح مثالیں موجود ہیں جن میں ’’حقیقت حسن‘‘،’’محبت‘‘اور بوئے گل‘‘ جیسے خیالی واقعات اس خوبی سے قلم بند کئے گئے ہیں کہ داد دئے بغیر نہیں بنتی ’’حقیقت حسن‘‘ میں اس راز کو کسی خوبی سے زمین پر پہنچا دیا گیا ہے کہ زوال جن کی جان ہے اور خیالی مرقعے بے حد دلکشی ہے۔

اقبال کی طرح جوش فطرت کے بہت بڑے شیدائی تھے ۔انہوں نے اپنی شاعری میں مناظر فطرت کو بنیاد بنایا ہے۔ بلکہ فطرت برائے فطرت کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جوش کی نظموں میں منظر کشی کا ایسا نورانی سیلاب نظر آتا ہے جو اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری وساری ہے۔کچھ ناقدین کا خیال ہے۔جوش نے اپنی نظموں میں وہ سارے الفاظ استعمال کئے ہیں۔جن کا مشاہدہ دریا کے کنارے،موجوں کے اٹھنے ایک دوسرے سے ٹکرانے کے موقعے پر ہوتا ہے۔اردو کے منظر نگار شاعروں میں جوش کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو مناظر سے لطف اندوز بھی کر دیتے ہیں۔اور اپنی انوکھی اُن علامتوں کی سیر بھی کراتے ہیں۔جن کا وہ اپنی شاعری میں ذکر کرتے ہیں۔ چاہیے وہ گنگا و جمنا کے کنارے ہوں ،تاج محل کے در و دیوار ہوں یا ہندوستان کے جنگلوں کے پرندے اور سبزہ زار ہوں جوش اپنی نظموں میں اِن موسموں کا بڑے شگفتہ اور منفرد الفاظ میں جا بجا ذکر کرتے ہیں۔ جو فطرت کی رنگارنگی سے قاری کو لطف اندوز ہونے میں مدد گار ہوتے ہیں۔ ربودگی کے عنوان سے ایک نظم میں جوش صاحب نے جو منظر نگاری کی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

ہو چکا ہے غروب مہر و منیر سامنے نہیں کوئی تصویر

سامنے کا ہرا بھرا جنگل ہو چکا ہے نگاہ سے اوجھل

کھوتی جاتی ہے ظلمتوں میں نظر   بے کسی ہے گھنی کھجوروں پر

گونج ہے بادلوں کی وادی میں   پڑ رہی ہے بڑی بڑی بوندیں

اور یہ راز بھی نہیں کھلتا

کہ مجھے انتظار ہے کس کا

(شعلہ وشبنم،صفحہ ۱۰۸)

جوش کا قوت مشاہدہ بہت گہرااور تیز ہے ۔یہی وجہ ہے۔کہ جوش نے جوخیالی تصویریں کھینچی ہیں وہ صداقت پرنظر آتی ہیں۔جوش کی منظرنگاری سے متعلق اشعار میں مبالغہ کم اور مشاہدہ زیادہ ہے۔اسلئے ہر منظر کی تصویر صاف ستھری نکھر آتی ہیں۔اس کی منفرد صفت یہ ہے۔کہ وہ ہر چیز کومتحرک بنادیتے ہیں۔وہ اپنی منظرکشی میں ڈوب کرخوشبواور شبنم کی نمی کی بھر پور احساس کرادیتے ہیں۔بقول پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں۔

''فطری مناظر کی جو کیفیت اور پُر جوش عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے۔اس کی نظریں ہمارے ادب میں بہت کم ہیں۔فطرت ان کے یہاں سادہ ورق نہیں بلکہ بولتی گاتی ہوئی حقیقت ہے۔جو اِن کے جذبات کو جگاتی ہے۔جوش قدرت کے مناظر کے عاشق ہیں ان کے دل قدرتی مناظر ہلکی پھلکی چٹکیاں بھی لیتے ہیں۔اور گڑگڑاتے بھی ہیں۔وہ فطرت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔

(اردونظم اور جوش ملیح آبادی،صفحہ ۲۰۱)

منظرنگاری کے لحاظ سے جوش، اقبال سے جدا شاعر ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہے کہ جوش نے اقبال کی طرح مناظر فطرت کے ذریعہ فلسفیانہ خیالات کو بہت کم واضح کیا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر فطرت برائے فطرت کا نظریہ اپنایا ہے، ان کی بہت سی نظمیں صرف منظرکشی کے لیے کہی گئی ہیں۔ جوش نے ایک نظم ''گریہ مسرت'' کے نام سے کہی ہے۔ جس میں حیدرآباد کی ایک تالاب ''عثمان شاگر'' کی مصوری ہے۔ اس نظم میں جوش نے خاص طور سے موجوں کی روانی دکھائی ہے۔

روح طوفانِ دربغل کف در وہاں لوسُنو، کس طرح تھیں موجیں رواں
جھاگ اُڑاتی، پھاندتی، اُڑتی ہوئی کپکپاتی، لوٹتی، مُڑتی ہوئی
بجلیاں، دامن میں چمکاتی ہوئی دم بہ دم آتی ہوئی جاتی ہوئی
اس طرح سے اس طرف ہوتی ہوئی پتھروں کو چھانٹ دھوتی ہوئی
گرتی، پڑتی، مست، سردھنتی ہوئی مرتعش قالین سابنتی ہوئی
گنگناتی صف بہ صف آتی ہوئی لڑتی، بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی
مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی ہچکیوں پر، ہچکیاں لیتی ہوئی
جابجا دل دل کاجل پارتی چوکڑی بھرتی، چھلانگیں مارتی
بلبلاتی، بھاگتی، منھ موڑتی مُڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی

گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی
دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

(سیف وسبوح، جوش، صفحہ ۸۱)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جوش ملیح آبادی الفاظ کے جادوگر ہیں۔مگر بعض وقت میں اِن کی یہی جادوگری عیب بن جاتی ہے۔کبھی کبھی جوش بغیر سمجھے الفاظ کا ایک منظّم جلوس پیش کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر اِن کی ایک نظم ''سویرا'' میں جوش صبح کے مختلف پہلو دکھاتے ہیں۔

ایک تھی وہ بھی صبح خوش بنیاد صبح رامش گر ملیح آباد
گل بکف، مشک بار، زمزمہ سنج لیلیٰ، محمل امانی گنج
روح میں کروٹیں بدلتی صبح جھولتی، کھیلتی، مچلتی، صبح
بوئے انفاس سے معطر صبح روئے ناشتہ سے منوّر صبح
مست پنگھٹ پہ گنگناتی صبح جھومتی، ناچتی، نچاتی، صبح
لاجو روی کبھی، بسنتی صبح بے جھجھک گاہ لاجونتی صبح
نیند میں بھولتی، بھٹکی صبح سایہ زلف میں چٹکتی صبح
خلوتِ ناز کا فسانہ صبح
گل و شبنم کا شایانہ صبح

(سرو خروش، صفحہ ۱۱۲، ۱۱۱)

جوش کی منظریہ شاعری کا ایک نمایا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فطرت سے لطف اندوز حاصل کرتے ہیں۔جوش ہندوستان کے ہر منظر کے پرستار ہیں۔آپ کو ہندوستان کے موسم بھی پسند ہیں۔جوش ملیح آبادی کو نظیر اکبر آبادی اور محمد قلی قطب شاہ کی طرح برسات سے خاص دلچسپی ہے۔جوش کی روح برسات کے موسم میں شگفتہ ہوجاتی ہے اور وہ برسات کے مناظر میں کھوجانا چاہتے ہیں۔اسی وجہ سے

انھوں نے برسات پر کافی نظمیں کہی ہیں۔اس کی ایک نظم ''برسات کی گھٹا'' کے نام سے ہے۔خود جوش کو یہ نظم بہت پسند ہے۔اس نظم کے چند بند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

کیا جوانی ہے فضا میں مرحبا' صدحبا　　چل رہی روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آ رہی ہے دور سے کافر کی صدا　　حُسن اُٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

آرزو میں ہے تلاطم' جوش ارمانوں میں ہے　　حسرتوں میں ولولے ہیں تازگی جانوں میں ہے
نوجوانی کا تبسم' سرد میدانوں میں ہے　　روشنی ہے دشت میں' خوشبو بیابانوں میں ہے
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

(شعلہ وشبنم، جوش' صفحہ')

جوش ملیح آبادی کی منظریہ شاعری نامکمل رہے گی اگر ہم ان کی نظموں کا ذکر نہ کریں۔جن میں جوش نے فطرت کی مصوری کے ساتھ ساتھ جذبات عشق کا بھی اظہار کیا ہے۔اس معاملے میں بھی جوش' محمد قلی قطب شاہ اورنظیر آ کبرآبادی سے ملتے جلتے ہیں۔جوش کا یہ عشق خصوصاً فطرت کے حسین مناظر اور وصل کے درمیان جوش پر آ جاتا ہے۔جوش حسینوں کے ناز وانداز اور وصل وملاقات سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔یہی جوش کی فطرت نگاری کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس کی تصویریں جوش نے اپنی نظموں میں کھینچا ہے۔

وہ گھر چلی آرہی ہیں گھٹائیں　　جوانی کی جیسی مسکتی قبائیں
رنگیلے اِشارے' کٹیلی ادائیں　　مزا جب ہے دریا کے اس پار جائیں

حسینوں کو یہ کہہ کہہ کے پٹی پڑھائیں چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں

کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

ملاروں کی موجوں پہ رقصاں ہیں دھارے بیابان وگلزار ارجل تھل ہیں سارے

دوپٹوں کو ڈھلکائے سینے اُبھارنے حسین آرہے ہیں کنارے کنارے

انھیں بڑھ کے آؤ گلے سے لگائیں کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

(سبووصبا، جوش، صفحہ ۲۹۵)

ہم کو جوش ملیح آبادی کی فطرت نگاری شاعری میں صداقت اور حقیقت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ان کی منظر نگاری میں ہندوستان کی روح رقص کرتی نظر آتی ہے۔

بہر حال گذشتہ صفحات میں اردو کے مشہور شعرا کی منظر نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ان صفحات میں دور قدیم سے لے کر دور جدید کے نامور شعرا کی منظر یہ نظموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔چونکہ منظر نگاری کی زیادہ ترقی دور جدید میں ہوئی ہے۔اس لیے اس دور کے بڑے شاعروں نے منظر نگاری کی ترف توجہ کیا ہے۔اس سلسلے میں ہم چند شعراء کا ذکر کر چکے ہیں اگر چہ شعرا کی حیثیت زیادہ مسلم نہیں ہے پھر بھی انہوں نے منظر نگاری کی طرف خاص طور سے توجہ کی ہے۔اور زیادہ تر شعرا نے کامیابی حاصل کی ہے۔

پانچواں باب:

اردو کے نمائندہ شعراء کی نظموں میں منظر نگاری

نمائندہ شعراء کے نام۔

(۱) نظیر اکبر آبادی
(۲) الطاف حسین حالی
(۳) اسماعیل میرٹھی
(۴) اکبر آلہ آبادی
(۵) جوش ملیح آبادی
(۶) فیض احمد فیض
(۷) محمد حسین آزاد
(۸) سرور جہاں آبادی
(۹) علامہ اقبال
(۱۰) نظم طباطبائی
(۱۱) اختر شیرانی
(۱۲) اختر الایمان

ولی محمد، نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰)

اردو کے وہ پہلے عوامی شاعر ہیں جن کا مجموعی کلام عوام کی براہِ راست زندگی سے وابستہ ہے۔ اردو میں ادب برائے زندگی کی جو روایت شروع رہی ہے اس کا آغاز ہی نظیر اکبر آبادی سے ہوتا ہے۔بقول طلعت حسین نقوی لکھتے ہیں۔

> ''منظر نگاری کرتے وقت ،نظیر تماشائی کی حیثیت سے اِس کا بیان نہیں کرتے بلکہ اس منظر میں پوری طرح ڈوب کر اِس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔''
>
> (نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری،صفحہ ۵۶)

نظیر کی شاعری کے دو اہم پہلو ہیں ،ایک اس عہد کے لوگوں کے معاشرتی ،سماجی و سیاسی رویے اور رسومات دوسرا اِن کی شاعری کے وہ موضوعات جن پر ان سے قبل نہیں لکھا گیا۔نئے موضوعات کا زاویہ نظر پڑھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے مثال کے طور پر ان کی نظم آندھی،اندھیری' کی مثال دی جاسکتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنے رنگ میں سب سے الگ اور اہم ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> ''نظیر اپنی تہذیب کے فسانہ خواں اور مصور ہیں ان کے نغمے بھی اس تہذیب کے نغمے ہیں اور ان کا اُتار چڑھاؤ بھی اس تہذیب کو روح پھونکتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو،صفحہ۱۰۱۷)

بظاہر ہندوستانی تہواروں پر نظیر سے پہلے بھی نظمیں دیکھنے کو مل جائیں گی۔محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں بھی ہمیں ہولی اور دیگر تہواروں پر نظمیں ملتی ہیں موزانہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہولی کا جو رنگ نظیر نے پیش کیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا ہے۔یہ مکمل تصویر نظیر ہی کا خاصہ ہے۔دراصل لفظوں کا انتخاب تصویر کشی کی یہ فنکاری ہمیں نظیر کے یہاں ملتی ہے۔نظیر اکبرآبادی نے جتنے بھی الفاظ استعمال کئے ہیں وہ گردوپیش کی بولیوں اور زبانوں سے لئے گئے ہیں۔الفاظ میں اضافے کا سبب نظیر کے کلام میں ہمیں برمحل دکھائی دیتا ہے۔نظیر اکبرآبادی کے یہاں روزمرہ محاورات صنائع بدائع بھی ملتے ہیں۔موضوع کی مناسبت سے زبان کا استعمال بھی نظیر کی خوبی ہے۔ہندو تہواروں کے حوالے مذہبی اصطلاحات خوب استعمال کرتے ہیں۔ان کے یہاں ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ ایک ہی بند میں ایسے لفظ مل جاتے ہیں۔ جو کسی دوسری کے یہاں نہیں ملتے۔ یہ استعمال اِن کی قدرتِ الفاظ کی گواہی دیتا ہے وہاں اِن کے مشاہدات کائنات کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے۔نظیر اکبرآبادی نے غزل،نظم، واسوخت، مثنوی،مرثیہ،قصیدہ،شہرآشوب اور رباعی یعنی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کائنات کی حقیر ترین مخلوقات پر لکھ دیتے ہیں ۔جو اِن کی قوت اظہار کا ثبوت ہے۔ان کی نظموں میں قدرتی مناظر کا بیان جابجا ملتا ہے جس میں برسات،آندھی،چاندنی رات اور بہار وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔یعنی برصغیر کا ہر موسم ہی اپنی خصوصیت کی بنا پر حسین ودلکش ہے اور اِن دلکش موسموں کو اپنی نظموں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

برسات کا تماشا ،برسات کی بہاریں وغیرہ موسم برسات سے متعلق نظیر کی اہم نظمیں ہیں۔چونکہ

نظیر فطرت پرست شاعر ہیں اس لیے وہ ہمیں مناظر کی مصوری کرتے ہوئے مناظر فطرت کے مختلف رنگ و انداز د پیش کرتے ہیں اور خود بھی اِن مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے — جگنو چمکتے پھرتے جوں آسمان پہ تارے

لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے — گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(کلیاتِ نظیر، صفحہ ۵۴۶۔۵۴۷)

نظیر نے اپنی شاعری میں جو تصویریں پیش کی ہیں وہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ یہ سب چیزیں خاص ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہیں۔ ان میں ذرا بھی اجنبیت نہیں ہے۔ نظیر کے مناظر کی دلفریبی اور حُسن کی بڑی وجہ مقامی رنگ اور زبان کی سادگی بھی ہے اِن اشعار میں جا بجا تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ برسات میں جا بجا اشجار اتنے سر سبز ہیں کہ انھیں لفظوں کی جنت کہیے تو بجا ہے اور کوہ وصحرا کی سبزی کا یہ عالم گویا وہ مخمل ہے۔ پہاڑ بھی سبز ہے اور شاخوں پر پھول اس طرح کھلے ہیں جیسے محبوب سبز قبا سرخ دستار پہن رکھی ہو دوسری طرح گرمی کے موسم میں بجلی کا چمکنا جیسے بادل کے آنے اور برسنے کی نوید ہے۔ ساون میں اندھیری کی تعریف میں کہتے ہیں کہ میں کس کو کس سے تشبیہ دوں جگنو چمکتے ہیں جس سے آسمان رقص کرنے لگتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جو لفظوں کا انتخاب کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اس نہج کی منظر نگاری سے متعلق ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں۔

''اردو میں برسات پر نظمیں جو ملتی ہیں اُن میں ایک تاثراتی کیفیت پائی جاتی ہے جس کا سب سے خوش آئندہ پہلو اس کی منظر نگاری ہے۔''

(تنقیدی نقوش،صفحہ ۱۶۴)

نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں فطرت کے ذریعے فلسفہ پر ایک تمثیلی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔نظیر نے اس بات کو ثابت بھی کیا ہے کہ فطرت کی بہت سی اشیاء ظاہر میں مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں۔دراصل نظیر اپنی شاعری میں منظر نگاری کے مختلف نمونے پیش کرتے ہیں جن کا تعلق فطرت پرستی سے ہے۔

کہا یہ دل نے مجھے ایک دن کہ باغ کو دیکھ ذرا تو چل کے گلستان شب چراغ کو دیکھ
جوں ہی گیا میں چمن میں تو دل ہوا اخرم گلوں کے حسن کو اور ناز اور باغ کو دیکھ
کہ اس میں آیا نظر مجھ کو ایک گل لالہ میں شاد اس سے ہوا عیش با فراغ کو دیکھ
یکا یک اس نے کہا تو نظر نہ کر مجھ پر نہ میرے بادہ شبنم سے پُر ایاغ کو دیکھ

نہ میری دیکھ تو سبزی نہ رنگ سرخ نظیر
ہے دردمند اگر تو ،تو میرے داغ کو دیکھ

(کلیات نظیر،صفحہ ۳۲۶)

نظیر نے مذکورہ اشعار میں فطرت کو پیش کیا ہے۔نظیر نے غم کا پیام ایک گل کے ذریعہ اہل دنیا تک پہنچا دیا ہے یہ پیام بہت لطیف اور بہت رنگیں ہے۔اس فلسفہ میں منظر نگاری کے تصورات کو پیش کیا ہے جو نظیر کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد (۱۸۳۴ء۔۱۹۱۰ء)

دور جدید کی نظموں میں منظر نگاری کے آغاز کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ محمد حسین آزاد جب فکرِ معاش میں دلی سے لاہور پہنچے تو آپ کو وہاں انگریزی زبان کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اس زمانے میں انگریز افسر کرنل ہالیڈ وہاں زیر تعلیم تھے اور اُردو سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ محمد حسین آزاد کو اِن کی سرپرستی کا سہارا ملا ہے مولانا محمد حسین ابتداء ہی سے اردو شاعری میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ یہ موقع آزاد کو لاہور میں حاصل ہوا ہے۔ اسی سال اپریل ۱۸۶۷ء میں انھوں نے طلبہ اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مخاطب کیا ہے اور ان کو نئے علوم وفنون کی تحصیل کے لیے آمادہ کیا۔ اگست ۱۸۶۷ء میں انھوں نے انھیں مقاصد کے حصول کے لیے لاہور میں ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن پنجاب کے زیر انتظام مشاعرے ہوتے تھے مگر غزلوں کے بجائے نظموں کے موضوعات مقرر کیے جاتے تھے اور انھیں پرطبع آزمائی کی جاتی تھی۔ مولانا آزاد نے اس دور میں کچھ ادبی تقریریں پیش کیں جن کا مقصد مختلف ادیبوں کے مزاج میں انقلاب پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اگست ۱۸۶۷ء میں ایک نظم ''نظم کلام موزوں'' کے باب میں ایک تقریر کی ہے اس کے بعد انھوں نے ''اردو زبان کی انشاپردازی'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اہل انجمن کے سامنے کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے خود مئی ۱۸۷۴ء میں مثنوی شب قدر'' کہی۔ بقول سید ممتاز علی مولف ''مجموعہ نظم آزاد'' یہ پہلا دن تھا۔

''جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی''

(مجموعہ نظم آزاد، دیباچہ سید ممتاز علی صفحہ ۷)

اس دور میں شب قدر کے علاوہ مولانا آزاد نے ''ابر کرم'' موسم زمستاں اور ''صبح امید'' مثنویاں

کہیں ہیں۔آزاد کی نظم ''ابرِ کرم'' منظر نگاری کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔اس نظم میں آزاد نے گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے۔

اب یہاں جو چند روز سے جاری نظام تھا
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام تھا
دُنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی
پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفل بنات پیاس کے مارے
خلق خدا کے نعرے بہت دور تک گئے

(مجموعہ آزاد، صفحہ ۲۸، ۲۹)

مذکورہ اشعار میں بہت سادگی ہے۔مولانا آزاد نے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے۔اِن اشعار میں مبالغہ نہیں ہے۔اس لیے آزاد گرمی کی اصل کیفیت کو بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اِن اشعار میں صحیح منظر نگاری پائی جاتی ہے۔آپ نے مذکورہ اشعار میں جو بھی کچھ بیان کیا ہے وہ ہمارے تجربہ میں ہے۔اس گرمی کی شدت کو بیان کرنے کے بعد مولانا آزاد نے برسات کا ذکر کیا ہے۔

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا | اور روئے سبزہ زار کو دھوکر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے | اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ دشت میں تالاب آب کے | گویا چھلک رہی ہیں کٹورے گلاب کے
کوئل کا دُور دُور درختوں میں بولنا | اور دل میں ہل درد کے نشتر کھولنا
طاؤس کا وہ دم کو چنور کرکے ناچنا | اور مورنی کا اشک موتی کو جانچنا

املی کے اک درخت پہ جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

(مجموعہ نظم آزاد، صفحہ ۳۸،۳۹)

مذکورہ اشعار میں برسات کی صحیح منظر نگاری پائی جاتی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا آزاد نے یہاں پر مبالغہ سے کام لیا ہے۔اس کے علاوہ تشبیہات اور استعارات کی بھی بھر مار نہیں ہے۔مولانا آزاد نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے یہی اس کی اصل منظر نگاری کی پہچان ہے۔یعنی درختوں کی ڈالیوں کا جھومنا، آب رواں کا لہرنا، طاؤس کا ناچنا، کوئل کا کُو کُو کرنا، یہ سب ایسے مناظر ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔کلیم الدین احمد منظر نگاری کے بارے فرماتے ہیں۔

''یہ تصویریں خیالی اور مصنوعی نہیں ہیں''

(اردو شاعری میں منظر نگاری، صفحہ ۲۳)

بہر حال مولانا آزاد نے برسات کا پُر لطف نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے لیکن بعض اشعار میں کمی پائی جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آزاد کا انداز بیان ہے۔آپ کے مصرعوں میں بعض وقت بڑی

بے ترتیبی ہوتی ہیں۔مثلاً آزاد کے افعال کے اجزا جدا جدا ہوتے ہیں جس کو ذوقِ سلیم گوارانہیں کرسکتا ہے۔مولانا آزادافعال کی فطری ترتیب کا خیال رکھتے تو زیادہ کامیاب مصور ہوتے ہیں۔اِن خامیوں کے باوجودمولانا آزاد کے فطری بیانات میں جوخوبی ہے وہ آزاد کے بے تکلف انداز بیان ہے۔اِن کے منظر نگاری کے بیانات میں قدیم شعرا کی طرح تصنع اورآ درتکلف نہیں ہے۔اس بارے میں پروفیسر عبدالقادرسروری نے فرماتے ہیں۔

''آزاد کے نثری کارناموں سے ہٹ کرمحض ان کی شاعری پرنظر ڈالیے تو آپ کومحسوس ہوگا کہ قدیم شاعری کے مصنوعی چمن زاروں سے نکل کر آپ ایک خود درار خطے میں پہونچ گئے جہاں کی ہر چیز اپنی دل کشی اوررعنائی کے لیے صرف دست قدرت کی مرہونِ منت ہے۔اس میں اورشام کے سمے ،پرندوں کی چہک،پھولوں کی مہک،آبشاروں کا شور،سبززاروں کی دلکشی اور کہساروں کی بے ترتیبی ،غرض حُسنِ فطرت کی ایک بوقلمونیوں کا پورانقشہ موجود ہے۔''

(جدیداردوشاعری،صفحہ۱۰۲)

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

الطاف حسین حالی نے بھی منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔آپ نے بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح فطرت برائے فطرت استعمال کیا ہے۔حالی نے برکھارت کی تصویر سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نظم ونثر میں سادگی پسند کرتے تھے۔اس لیے ''برکھارت'' بھی سادگی کی حامل ہے اس میں بانگِ دُہل اعلان کر رہی ہے کہ اب منظر نگاری کا زمانہ آ گیا ہے۔حالی نے گرمی کی شدت بیان کی ہے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کُہسار
بھوبل سے ہوا تھا ریگِ صحرا — اور کھول رہا تھا آب دریا
سانڈے تھے بلوں میں منھ چھپائے — اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھیں لومڑیاں زبان نکالے — اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ — ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست — گھڑیال تھے روربار میں سُست
بھیسوں کے لہو نہ تھا بدن میں — اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

پنکھے سے نکلی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے ہوا تھی

(برکھارت،صفحہ ۴۵،۴۶)

حالی کے یہاں منظر نگاری کی تفصیلات زیادہ واضح ہیں۔مذکورہ اشعار میں حالی نے گرمی کی شدت

بیان کیا ہے۔حالی نے مختلف جانوروں پر گرمی کے اثرات نہایت سلیس الفاظ دکھائے ہیں۔حالی کی منظر نگاری دلکش ہے۔آپ کے اس نظم کا مقابلہ نظیر کی برسات اور پھلن سے کیا جا سکتا ہے۔

حالی کی طرح نظیر نے بھی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور غالباً اس معاملہ میں نظیر حالی سے کم نہیں ہیں۔نظیر کے یہاں یہ خرابی ہے کہ ان کی زبان بے لطف ہوتی ہے اور حالی کی زبان میں لوچ ہے۔اس لئے ہم کو حالی کی برکھارت میں زیادہ لطف آتا ہے۔

دور جدید کی شاعری کی ترقی میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔حالی نے ''ترکیب بندموسوم'' رموز قیصری'' میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔اس ترکیب بند کا مرکزی مضمون اتحاد اور ہمدردی ہے۔اس مضمون سے قبل مولانا حالی نے ہندوستان کے مختلف مناظر پیش کیے ہیں۔مناظر کا یہ بیان بہت صاف ستھری اور واضح ہے۔

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستان — زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں

اک طرف کھینچی ہے قدرت نے تیرے دیوار کو — موجزن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بیکراں

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کے وہ عالم برف کا — ہے صدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں

بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار — جب کہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کا فکر — دست گل چیں ناز ساؤ نخل دولت گل فشاں

تو نے فارغ کر دیا ہے فتح ملک غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیرا نشان

(دیوان حالی،صفحہ ۱۴۸)

مولانا حالی نے پہلی بار ایک مخصوص انداز میں حب الوطنی کی شاعری کی ہے۔اور اپنے ملک کے پہاڑوں اور دریاؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔اس دور میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اس لیے مولانا حالی نے اس جذبہ کو نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔حالی نے اپنے ملک کی مدح سرائی صاف الفاظ میں کی ہے لیکن حالی نے یہاں فطرت کا استعمال بطور پس منظر کیا ہے۔اس لیے فطرت کی واضح جھلکیاں موجود نہیں ہیں۔مولانا حالی کی منظر نگاری زیادہ قابل ہے جس میں انھوں نے مصوانہ شاعری کے بھی کمالات دکھائے ہیں۔حالی نے ایک نظم ''سیر کشمیر'' کے عنوان سے لکھی ہے جس میں کشمیر کی منظر کشی ہے۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں

سبزہ ونسرین وگل کی سر زمین کہیے اسے

صفحہ گیتی پہ یا خلد بریں کہیے اسے

فی المثل تختہ زمرد ہے واں اک سبزہ زار — سایہ افگن اس طرح ہیں ہو بہو اس پر چنار

جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر — زیر و بالا اُونچے نیچے گھر قطار اندر قطار

تھی بنانے سے غرض تیرے یہی باغِ نسیم — باغِ جنت کا نہ انسان کو رہے کچھ انتظار

چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی — جابجا گویا کھڑے ہیں دیوا روجن پہردار

ان کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا — سینہ گردوں سے گویا اب نکل جائیں گی پار

روز روشن میں جب ان کا جھیل پر پڑتا ہے عکس

نقرئی پانی کی اس کے پھر کوئی دیکھے بہار

جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دُنیا میں نہیں — تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالامال ہے　　ہر چمن میں یاں مہیا ہیں مکاں بہرِ مکیں

ان مکانوں اور خیالوں سے جب آگے بڑھے　　پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں

جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر مستی　　ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یونہی

یعنی اقلیمِ ابد اور یہ جہاں خاموشی　　طاقتِ انسان کی حد سی ہیں پرے دونوں کہیں

طرفہ سناٹا ہے اس سنسانِ کوہستان پر　　جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دل نشین

ہیں سراسر ناپزیر آثار انسانی یہاں

منہ لپیٹے ہیں پڑے اسرارِ یزدانی یہاں

(نظم معریٰ اور آزاد نظم، صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

بہر حال اتنا تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ حالی نے اپنے ملک کے پہاڑوں اور دریاؤں کا ذکر بطور منظر نگار کی حیثیت سے کیا ہے اس لحاظ سے حالی کی شاعری میں ایک نئی آواز ہے۔

سرور جہاں آبادی (۱۸۷۳ء۔۱۹۱۰ء)

منظر نگاری کے سلسلے میں کا آپ نام بھی آتا ہے۔آپ کو منظر نگار شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ بقول نوبت رائے نظر لکھتے ہیں۔

''مناظر قدرت پر بھی انھوں نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے اور مشکل سے کوئی دلفریب منظر کی نظر سے بچ رہا ہے۔''

(ادیب رسالہ، الہ آباد، فروری، ۱۹۱۱ء)

درحقیقت سرو جہاں آبادی نے منظر نگاری کے مختلف پہلو ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔سرور کو بچپن سے دلچسپی تھی اور خصوصاً وہ پھولوں کے پرستار تھے۔چنانچہ وہ ''خم کدہ سرور'' کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

''ناظریں بچپن میں، میں پھولوں کا بڑا شوقین تھا مگر بدقسمتی سے اپنے گھر کے صحن کے آگے بھی پھولوں کا کوئی تختہ یا چھوٹا اک سا کنج نہ تھا کہ جس میں اپنی ننھی سی تفریح کوتروتازہ رکھتا ہے یہ ایک ناخوش گوار کمی تھی جو مجھ کو ہر وقت مغموم اور افسردہ بنائے رہتی تھی۔ننھی سی جان اور پھولوں کا یہ ارمان اتنی جراءت کہاں کہ خود بازار جا کر گل فروش کی دوکان سے ایک پھول مول لاؤں اور ان سے اپنا دل بہلاؤں۔''

(خم کدہ سرور،صفحہ ۶۲)

اس میں سرور جہاں آبادی نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کو کسی خاص قسم کے پھول بھی پسند نہ تھے۔بلکہ وہ ہر پھول سے محبت کرتے تھے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچپن ہی سے فطرت کے شیدائی تھے۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مرتے دم تک فطرت کے شیدائی رہے ہیں۔ان کو قدرتی نظاروں سے کافی لگاوَ تھا۔اور اُن نظاروں کی ذکر اپنی شاعری میں حسین انداز میں کیا ہے۔اس حوالے سے اِن کی ایک نظم ''بیر بہوٹی'' کے عنوان سے ہے جس میں سرور جہاں آبادی نے منظر نگاری کی تصویریں بہت ہی دلکش انداز سے بیان کی ہے۔

کچھ عجب عالم ہے تیرے حُسن کے انداز کا سُرخ دوڑا ہے کسی چشمِ فنونِ پرواز کا

قطرہ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا　　　قلبِ خوں گشتہ ہی مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا زمین پر جلوہ گر

جامِ زرّیں میں ہے یا صہبائے خوں جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلہ تنویرِ حُسن　　　خون عاشق یا زمین پر ہے گریباں گیرِ حُسن

یا عقیق سُرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حُسن　　　نقش نیرنگِ خوں ہے یا کوئی تصویرِ حُسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادی پر خار ہیں

سُرخ تکمہ ہے قبا ئے سبزۂ کُہسار ہیں

(بیر بہوٹی، صفحہ ۲۵)

شاعر نے مذکورہ بندوں میں بیر بہوٹی کی شکل و شباہت پر روشنی ڈالنے کی کافی کوشش کی ہے۔اگر چہ انھوں نے اس تصویر کشی میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔اس کے باوجود بیر بہوٹی کی شکل واضح نہیں ہوئی ہے۔اس کے علاہ سرور جہاں آبادی کے انداز بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بیر بہوٹی سے لطف حاصل کررہے ہیں۔سرور جہاں آبادی کی اس منظر نگاری میں فطرت سے لطف اندوز کا جذبہ اکثر وبیشتر نمایاں رہتا ہے۔انھوں نے ایک نظم ''چشمہ وطن'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں منظر کشی اپنی جوبن پر مبنی ہے۔

جاری رہے گا یوں ہی تو وطن کے چشمے　　　انداز خوش خرامی ہرگز یہ کم نہ ہوں گے

اے غم گسارطفلی! لیکن یہ غم ہے مجھ کو　　　ساحل پہ آہ تیرے اپنے قدم نہ ہوں گے

گزرے گا سبزہ زاروں میں کھیلتا ہوا تو　　　موجوں تیرے دلکش کیا پیچ وخم نہ ہوں گے

یوں ہی رواں رہے گا تو سبز وادیوں میں ساحل پہ آہ! تیرے اپنے قدم نہ ہوں گے

ہلتی رہے گی یوں ہی پھولوں کی تیرے بیلیں جھونکے نسیم کے یہ کیا صبح دم نہ ہوں گے

کھیلا کریں گی تجھ سے سورج کی کرنیں دن میں کیا شب کو چاندنی کے سامان بہم نہ ہوں گے

رونق یہی رہے گی تیری وطن کے چشمے

ساحل آہ! تیرے اپنے قدم نہ ہوں گے

(چشمہ وطن، صفحہ ۱۴۸)

مولانا اسماعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء۔۱۹۱۷ء)

آپ کا نام بہت ہی اہم ہے۔نظیر اکبر آبادی اور حالی نے جس منظر نگاری کی بنیاد ڈالی تھی۔اسماعیل میرٹھی نے اس مشن کو ایک عمارت بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔دراصل اِن کی منظر نگاری حالی کی منظر نگاری سے زیادہ واضح سلیس اور فطری ہے۔اسماعیل میرٹھی کی منظر نگاری کی خوبیوں کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی سراہا ہے۔

''اسماعیل کے موضوع اکثر وبیشتر دیہی یا دیہاتی ہیں۔نظموں کی فضا بھی دیہی ہے اور اسلوب موضوع کے بالکل مطابق ہے۔ان اجزا کے اختلاط سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے ۔اردو کے لیے بالکل نئی چیز ہے ۔قدیم شعرا کی بلند آہنگی اور موشگافیوں کے مقابلہ میں جب ہم اسماعیل کی نظمیں ''اسلم کی بلی'' ''ہماری گائے'' اور صبح کی آمد وغیرہ پڑھتے ہیں تو

ہم پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔"

(جدیداردوشاعری،صفحہ۱۵۷)

دراصل اسماعیل میرٹھی ایک دیہی شاعر ہیں اس لحاظ سے اسماعیل کی شاعری انگریزی کی شاعری (Rustic Poetry) سے بہت ملتی ہے۔اسماعیل میرٹھی نے انگریزی شعرا کی طرح دیہات کا مطالعہ نہایت عمیق نگاہوں سے کیا ہے۔اسماعیل نے جس منظر پر قلم اُٹھایا ہے۔وہاں اپنے مشاہدے اور تجربے کا ثبوت دیا ہے۔مثلاً ان کی ایک نظم "ہوا کی رفتار" اس کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے ہجوم طائرانِ خوش نوا ہے
کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سَن سے کبھی آہستہ رَو موجِ صبا ہے
غبار و گرد سے جو اَٹ گئی تھی صبا نے غسل کا سامان کیا ہے
ہَوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں کہ خونِ چمن کا سر ہلا ہے
چمن کا پتّہ پتّہ ہے نوا سنج صبا کی آمد آمد جابجا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک جھک گئی ہیں
زمین پر سبزہ کیا کیا لوٹتا ہے

(حیات اسماعیل،صفحہ۵۱)

مذکورہ اشعار میں تسلسل پایا جاتا ہے۔اس لیے غزل کی ہیت کے باوجود یہ نظم ہی ہے۔اس نظم میں قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ ہوا کے اثرات کی ذکر واضح بیان ہے ۔اس نظم میں اسماعیل میرٹھی نے مبالغہ سے پرہیز کیا ہے اس نظم میں کہیں کہیں جگہ پر حسن تعلیل موجود ہے۔اسماعیل میرٹھی نے ایک نظم شفق پر

بھی کہی ہے۔ یہ نظم بھی مصورانہ شاعری کی ایک حسین مثال ہے۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہو۔

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار	ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ	چمن دیکھ کر عقل ہوتی ہے رنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے	ہر اک روپ میں وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ	سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کوئی	نبفشی و نارنجی و چمپی
یہ کیا بھید ہے کیا کرامات ہے	ہر اک رنگ میں اک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ	بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اس میں سُرخی کی لاگ	ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے

کہ پر دے چھٹے لال باغات کے

(حیات اسماعیل،صفحہ ۶۵)

نظم پڑھنے کے بعد یہ یقین آ جاتا ہے کہ شاعر نے باقاعدہ شام کی شفق کا مطالعہ کیا ہے۔موسم برسات میں شام کے وقت شفق مختلف رنگ پیش کرتی ہے اور وہ رنگ بہت جلد جلد بدلتے رہتے ہیں ۔دراصل یہ فردوسی لمحات کچھ دیر کے لیے ہی رہتا ہے اور اس کے بعد رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے۔ یہاں پر شاعر نے نہایت کامیابی کے ساتھ برسات پر بھی نظم کہی ہے۔

وہ دیکھو اُٹھی کالی کالی گھٹا	ہے چادر فطرت چھانے والی گھٹا

گھٹا آن کر مینھ جو برسا گئی | تو بے جان مٹی میں جان آ گئی
زمین سبزے سے لہلہانے لگی | کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل | عجب بیل پتے، عجب پھول پھل
یہ دودن میں کیا ماجرا ہوگیا | کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا | وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا

ہزاروں پُھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

(حیات اسماعیل مرتبہ، صفحہ ۶۷)

اسماعیل میرٹھی کی یہ نظم بہت مشہور ہے۔ برسات پر لکھی گئی اس نظم میں سادگی موجود ہے۔ اسماعیل میرٹھی کو حالی پر ایک معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ اس نظم کو پڑھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اسماعیل میرٹھی کی منظر نگاری کو سراہا ہے۔ وہ اس بارے میں فرماتے ہیں۔

''جو چیز انھیں ذکر کا مستحق بناتی ہے وہ ان کی دیہی شاعری ہے آزاد کی طرح انھوں نے بھی نیرنگ قدرت کے شفق ونگار کھینچے کی کوشش کی اور اس میں انفرادی رنگ بھی حاصل کیا۔ اگر ان نظموں میں شان وشوکت نہیں تو بے رنگ و بے مزہ سادگی بھی نہیں ان کی سادگی میں ایک قسم کی دلکش ہے ان کی تصویریں عام نہیں خاص ہیں۔ اور ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہیں اور اِن تصویروں کو ان کی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ یہ خیالی

یا مصنوعی نہیں۔‘‘

(اردو شاعری پر اک نظر، صفحہ۴۸، ۴۹)

دراصل حقیقت یہ ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے نظموں کی خصوصیات یہی ہے کہ انھوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کو سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے خیالات میں سچائی وثوق ہے اور انداز بیان فطری ہے۔ پھر ان کے مناظر کا تعلق ہندوستان ہی سے ہے۔ اس لیے اسماعیل کی منظر نگاری میں ہندوستان کی روح سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا ۔۔۔ کیسی زمین بنائی کیا آسمان بنایا
پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی ۔۔۔ اور سر پر جو جوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوش نما اُگائے ۔۔۔ پہنا کے سبز خلعت ان کو جواں بنایا
خوش رنگ اور خوشبو گل پھول میں کھلائے ۔۔۔ اس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا
میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے ۔۔۔ چکھنے ہے جن کے مجھ کو شریں وہاں بنایا
سورج سے ہم نے پائی گرمی بھی روشنی بھی ۔۔۔ کیا خوب چشمہ تونے اے مہرباں بنایا
سورج بنا کے تونے رونق جہاں کو بخشی ۔۔۔ رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکاں بنایا
پیاسی زمیں کے منہ میں مینھ کا چوایا پانی ۔۔۔ اور بادلوں کے تونے مینھ کا نشاں بنایا
یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی ۔۔۔ قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا
تن کے اٹھا اٹھا کے لائیں کہاں کہاں سے ۔۔۔ کس خوبصورتی سے پھر آشیاں بنایا
اونچی اڑیں ہوا میں بچوں کو پر نہ بھولیں ۔۔۔ ان بے پروں کا ان کو روزی رساں بنایا

کیا دودھ دینے والی گائیں بنائی تو نے　　چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عناں بنایا

رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں میئسر　　ان نعمتوں کا مجھ کو پھر قدرواں بنایا

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے　　مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاری گری ٹپکتی

یہ کار خانہ تو نے کب رائگاں بنایا

(خدا کی کاریگری، صفحہ ۳۸، ۳۹)

علامہ اقبال ۱۸۷۳ء ۱۹۳۸ء

منظر نگاری کے مصوانہ بیان کی مثالیں ہم کو علامہ اقبال کی نظموں میں ملتی ہیں۔ایسی نظمیں اقبال کے ابتدائی دور میں نظر آتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں۔

''وہ اس دور میں مغرب کے فطرت پرست شعرا کے زیر اثر مناظر ومظاہر خارجی کی مصوری کرتے ہیں اور ان کی جمالی کیفیتوں کو بیان بھی کرتے ہیں۔''

(جدید شاعری، صفحہ، صفحہ ۱۷۲)

اقبال بہت بڑے منظر نگار شاعر تھے۔ جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں فطرت کے حُسن سے دور ہوتے جاتے ہیں علامہ اقبال اگر چہ یہاں بعد دور میں بھی منظر نگاری کی مثالیں ملتی ہیں مگر اقبال کو بعد کے فطرت کا بیان صرف ضمنی رہ گیا ہے۔دراصل بعد میں اقبال ایک فلسفی شاعر بن گئے ہیں۔اس لیے اقبال نے فطرت کو اپنے فلسفیانہ خیالات کے تجزیہ کے لیے استعمال کیا ہے اور فطرت آپ کے یہاں

محض ایک نقطہ بن گئی جہاں سے انھوں نے اپنے فلسفیانہ نظریات کی توضیح کے لیے مختلف دائرے کھینچے۔علامہ اقبال نے فطرت کو اپنے مقاصد کے لیے مغلوب کیا ہے۔اس لیے یہاں پر ہم اس کو فطرت پرست شاعر نہیں کہہ سکتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسی بنا پر علامہ اقبال کو ''حریف فطرت'' بھی کہہ ڈالا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کی عبارت ملاحظہ ہو

> ''اقبال کے یہاں فطرت سے اعتنائی کئی صورتیں ملتی ہیں۔مگر یہ اقبال کو شاعر فطرت کہنے میں پھر بھی خاصا مائل ہوتا ہے۔فطرت کی رعنائیوں اور دل،آویزیوں کی کوشش تو بالکل ایک قدرتی شے ہے۔اور اقبال کے کلام کے دور اول شاہد رعنائے'' فطرت سے راز و نیاز کے بھی کئی پہلو اور کئی روپ مل جاتے ہیں۔مگر اقبال کی ''انائے کل'' اور ذوق تسخیر کی ہمہ گیری رفتہ رفتہ اس قدر پذیر ہوتی جاتی ہے کہ اقبال کو شیدائے فطرت سمجھنے کے بجائے حریف فطرت کہنے کو جی چاہتا ہے۔''

(مقامات اقبال،صفحہ ۱۲۳)

علامہ اقبال کے کلام میں فطرت سے عشق کا دور ان کے فکری اور مقصدی رجحانات کی ترقی کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہوتا گیا مگر فطرت سے مصالحت کا رنگ نسبتاً گہرا اور دیر پا سا تھا۔اس لیے یہ خاصی دیر تک موجود رہا ہے۔اقبال لکھتے ہیں۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر　　　تسخیر مقام رنگ و بُو کر
بے ذوق نہیں ہے گرچہ فطرت　　　جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

(مقامات اقبال،صفحہ ۳۳)

بہر حال اقبال کو ہم حقیقی معنی میں منظر نگار شاعر کہہ سکتے ہیں اِن کے یہاں مناظر کی عکاسی مقصود ہے منظر نگاری کے پس پردہ کوئی نہ کوئی تخیل ہے جس کو سنوارنے کے لیے مناظر قدرت کا سہارا لیا گیا ہے۔اس حوالے سے اِن کی ایک نظم ''ستارہ کے عنوان سے ہے کہ جس میں منظر کشی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو　　مآلِ حُسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

متاعِ نُور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو　　ہے کیا ہراس فنا صورتِ شرر تجھ کو

زمین سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو　　مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے پھر تیری ننھی سی جان ڈرتی ہے

تمام رات تیری کانپتے گذرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے　　جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر　　فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرنیش گل　　عدم عدم ہے کہ آہینہ دارِ ہستی ہے

سکون محال ہے قدرت کے کار خانیں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

(نظم ستارہ،صفحہ ۳۲)

مذکورہ اشعار میں منظر نگاری کی ایک اچھی مثال ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں رسمی روایتی اور

کتابی منظر نگاری کو داخل کیا ہے۔یہ رسمی منظر نگاری انھوں نے زیادہ تر اردو ادب سے حاصل کیا ہے۔اردو کی رنگین اور خوبصورت ترکیبیں منظر نگاری میں موجود ہیں۔آپ کی منظر نگاری شاعری میں ہندوستان کی جھلک بہت کافی نمایاں ہے۔اور ہندوستان کے مناظر کا نقشہ آپ کے یہاں ملتا ہے۔

لطفِ ہمسائیگی و قمر کو چھوڑوں — اور اس خدمت پیغامِ سحر کو چھوڑوں

عارضی حُسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر — یہ ملا خسروِ خاور کا پیامی بن کر

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی — اس بلندی سے زمین والوں کی بستی اچھی

آسمان کیا عدم آباد وطن ہے میرا — صبح کا دامنِ صد چاک کفن ہے میرا

میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا — ساقی موت کے ہاتھوں سے صبح پینا

نہ یہ خدمت نہ یہ عزت نہ یہ رفعت اچھی — اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا نہ اختر بنتا — قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

وہاں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا — چھوڑ کر بحر کہیں زیبِ گلو ہوجاتا

ہے چمکنے میں مزہ حسن کا زیور ہوکر — زینت تاج سے بانوئے قیصر ہوکر

ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیب جاگا — خاتم دست سلیمان کا نگیں بن کے رہا

ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست — ہے گہر ہائے گراں مایہ کا انجام شکست

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل — کیا وہ جینا ہے کہ جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہوکر

کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہوکر

(صبح کا ستارہ،صفحہ۳۳)

اگر چہ اقبال کے یہاں خالص منظر نگاری کی مثالیں ہیں۔تاہم اِن کی نظموں میں مصورانہ جھلک ضرور موجود ہے جس کو انھوں نے بخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ایسی مصوری ہم کو اِن کی نظم ''شام میں ملتی ہے یہ نظم درائے نیکر (ہائیڈرل برگ) کے کنارے پر کہی گئی ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کُہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے   آغوش ہیں شب کے سوگئی ہے
تاروں کا خاموشی کا رواں ہے   یہ قافلہ بے دراواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت ودریا   قدرت ہے مرا قبہ میں گویا
اے دل تو بھی خموشی ہوجا
آغوش میں غم کو لے کے سوجا

(کلیات اقبال،صفحہ۱۰۹)

جب ہم اقبال کے کلام میں منظر نگاری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو بہار اور خزان میں مناظر کی جو بھی رنگینیاں، دریاؤں، جھیلوں اور ندیوں میں جو بھی روانیاں اور سبز زاروں اور پھولوں میں جس قدر بوقلمونیاں موجود ہیں وہ نکھر نکھر کے ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ بہار کے پورے کارواں کا ذکر کرتے ہیں۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اودے اودے ، نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح

اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

(کلیات اقبال،صفحہ ۳۰)

اکبرالہ آبادی ۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء

اکبرالہ آبادی نے مصورانہ کی ایک حسین مثال قائم کی ہے۔اکبرالہ آبادی نے ایک نظم ''روانی آب '' کے عنوان سے لکھی ہے اس میں اکبر الہ اابادی نے پانی کے بہاؤ کو مکمل طور سے پیش کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں غزل اور نظم پر طبع آزمائی کی ہے۔اس کے برعکس اِن کی نظموں میں منظر نگاری صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔اکبرالہٰ آبادی نے منظرکشی کے عنوان سے چند اشعار میں پانی کا بہاؤ بطور منظر نگاری کے ذریعے سے پیش کیے ہیں۔

اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

روانی میں اک شور کرتا ہوا رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا

پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا

وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا یہ سبزے پہ چادر بچھتا ہوا

وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا — یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا — اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
گل و خار یکساں ہوا — ہر اک سے برابر اُلجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا — ہوا کے طماچوں کو ہستا ہوا
بلندی سے گرتا، گراتا ہوا — نشیبوں میں پھرتا، پھراتا ہوا
وہ کھیتوں میں رائیں کترتا ہوا — زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا — وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا

ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا
خیالوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا

(کلیاتِ اکبر، صفحہ ۴۴۵، ۴۴۴)

دور جدید کی منظر نگاری اس عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اکبر کی یہ نظم ثابت کرتی ہے کہ دور جدید شعرا نے مغربی شعرا سے کس قدر فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر کتنی کامیابی حاصل کی ہے اکبر کی یہ مغربی شعرا کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اور یہ نظم بے حد کامیاب ہوئی ہے۔ اس نظم میں اکبر نے تیتروں کے رقص کا منظر دکھایا ہے۔

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں — اک آن میں سو طرف پھرتی دیکھیں
بھولی، خوش رنگ، چپت، تازک، پیاری — پہنے ہوئے فطرتی، منقش ساری
پھُرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا اُبھار — تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب کا دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم وہ بھی بلا زیادت و کم قائم

گو تابع جوشِ برق پروازی ہیں دونوں کے خطوط ایک متوازی ہیں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں

پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

(کلیات اکبر،صفحہ ۲۴۴،۲۴۵)

اکبرالہ آبادی نے مذکورہ اشعار میں تیتریوں کے رقص کی صحیح منظرنگاری کی ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اکبران کے حسن اورچستی وچالاکی سے متاثر ہوئے ہیں۔اکبر کی یہ مصوری اُن کے مشاہدے پرمبنی ہے۔اکبر نے اِن تیتروں کواُڑتے ہوئے دیکھا ہے۔کلیم الدین نے اس نظم کی تعریف یوں کی ہے۔

''کس سادگی،صفائی اور پاکیزگی سے تیتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی گئی ہے،یہ تصویر رسمی نہیں۔اکبراسی منظر سے متاثر ہوئے ہیں۔اس لیے یہ تصویر ایسی حسین و موثر ہے۔کاش وہ اس قسم کی نظموں کی طرف توجہ کرتے۔''

(اردوشاعری پراک نظر،حصہ دوم،صفحہ ۱۷)

اکبرالہ آبادی کی نظم ''روانی دریا'' میں منظرنگاری دیکھئے:

وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال جو انگریزی شاعر تھا اک باکمال

لکھی اس نے ہے نظم اِک لاجواب دکھائی ہے شکلِ روانیِ آب

جو پہنا ہے پانی میان لڈرو اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

مناسب جو انگلش مصادر ملے مُقفّے کئے ان کے سب سلسلے

یہ اصرارِ کرتے ہیں بھائی حسن کہ میں بھی ہوں اس بحر غوط زن

دکھاؤں روانیِ دریائے فکر جوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر

عجب ہی نہیں ان کی اس پر نظر گُجائیں گُجا سُودی نامور

سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں نہیں سہل اس راہ کی منزلیں

میرے پاس سرمایہ کافی نہیں وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں

زبان میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق

ادھر تو ہے کچھ ا ور ہی طمطراق

(روانی دریا،۱۲۳)

نظم طباطبائی (۱۸۵۳ء۔۱۹۴۴ء)

آپ نے بھی منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔آپ کے مختلف نظموں میں منظرکشی کے جلوے نظر آتے ہیں ۔اکثر یہ جلوے صاف اور روشن نہیں ہوتے ہیں بلکہ نہایت مبہم نظر آتے ہیں۔نظم طباطبائی کسی بھی منظر کی تصویر مکمل طور پر پیش کرتے ہیں۔اس لیے ان کی منظریہ نظموں کو پڑھنے سے ہمارے نظروں کے سامنے کسی منظر کا صیح نقشہ اُتارتا ہے۔مثلاً اِن کی ایک نظم ''برسات کی فصل'' کا چند بند ملاحظہ ہو۔

رُت ہے برکھا ساون کی راتیں چل رہی ہے ہوا سائیں سائیں

ابر کرتا ہے گردوں سے باتیں　　آ رہی ہے صدا سائیں سائیں
آگ پانی میں بادل میں بجلی　　اک طلسمات ہے آسمان پر
گرد ہے اب نہ گرمی نہ ہے دھوپ　　ابر ہے برق ہے اور ہوا ہے
باغ و صحرا کا ہے ایک سا روپ　　وہ ٹکڑے پڑ رہے ہیں مزا سے
دھوپ کو آ گئے ظلمت نے گھیرا　　اب وہ تیزی نہ وہ روشنی ہے
صبح سے شام تک ہے اندھیرا　　شام سے صبح تک چاندنی ہے
چاند کا راہ کترا کے چلنا　　ابر کا ساتھ ساتھ اس کے پھرنا

گھر سے چھٹنا اور چھپ کے نکلنا
نور ظلمت کا چھن چھن کے گرنا

(برسات کی فصل،صفحہ ۱۲۹)

اس نظم میں حسین الفاظ ہیں جو ایک دلکش نغمہ پیدا کرتے ہیں اور برسات فصل کی مصوری کرنے سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم کو لکھتے وقت انہی لفظوں کا انتخاب کیا ہے۔اس لیے منظر نگاری کے لحاظ سے یہ نظم بہت ہی دلکش ہے۔اسی نظم میں ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں۔

ابر کہتا ہے میں پیل تن ہوں　　برق کہتی ہے میں فتنہ زا ہوں
ابر کہتا ہے راہزن ہوں　　برق کہتی ہے میں رہنما ہوں
کہہ رہے ہیں یہ طائر چہک کر　　دشت و در منزلوں تک ہرے ہیں
کہہ رہی ہے یہ بجلی چمک کر　　دیکھ پانی کے ڈبے بھرے ہیں

ڈالیاں وجد میں جھومتی ہیں ناز کرتی ہیں اترا رہی ہیں

جھک کے ساحل کے لب چھومتی ہیں

موج دریا کو شر مارہی ہیں

(برسات کی فصل،صفحہ۱۳۱)

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۴ء۔۱۹۸۳ء)

جوش ملیح آبادی دور جدید کے سب سے بڑے منظر نگار شاعر ہیں۔وہ صرف منظر نگار شاعر نہیں ہیں بلکہ فطرت پرست بھی ہیں۔ یہ فطرت پرستی کا جذبہ جوش کی روح میں بچپن میں پیدا ہو گیا تھا۔جوش نے اس فطرت میں اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔جوش نے اپنے مجموعے کلام ''روح ادب'' میں لکھا ہے۔

> ''اے صبح صادق'اے عروس فطرت میں اس ناچیز تصنیف کو تیرے نورانی قدموں سے مس کرنے لایا ہوں۔اس سے قبول کر،اگر تو مسکراتی تو میں غور کرنے والا شاعر لوح محفوظ کا مطالعہ کبھی نہ کرسکتا،نہ شاہد معنی کا رخسار دیکھ سکتا۔''

(روح ادب،صفحہ'۱۵)

جوش ملیح آبادی فطرت کے نام سے یہ انتساب ان کے زبردست جذبہ فطرت پرستی کی غمازی کرتا ہے۔اس نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ فطرت کے درمیان میں گزارا ہے۔اتنا ہی نہیں ہیں بلکہ فطرت کے درمیان بیٹھ کر اشعار بھی کہے ہیں۔جوش اس مجموعے میں لکھتے ہیں۔

''مارچ کا مہینہ ہے بہار ابھی کم سن ہے، ہوا خوشبو سے مست ہے صُبح کا وقت ہے، سرسبز باغ کا ایک گوشہ ہے، میں اس گوشہ میں بیٹھا ہوا شعر کہہ رہا ہوں۔ نازک نازک درخت اپنی پتلی پتلی شاخوں کا سایہ ڈال رہے ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں کش مکش کرتی ہیں اور آنہیں سکتیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں گا رہی ہیں پُھدک پُھدک کر' چہک چہک کر یہ گنگناتے ہوئے چشمے سے پانی پی رہی ہیں۔ پانی میں طرح طرح کے پھول اور خوشرنگ پتیاں بہہ رہی ہیں۔ چڑیاں ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اُڑ اُڑ کر جا رہی ہیں اور نرم نرم شاخیں لچک رہی ہیں ایک چڑیاں سب سے بلند شاخ پر یا ''دوستو یا دوستو'' کی صدا لگا رہی ہے۔ ایک ''تو ہی۔ تو ہی'' کے ترانے گا رہی ہے۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہیں خوشبو کے وزن سے تیز نہیں چل سکتی۔ پتیاں رقص کر رہی ہیں اور دھیمی آواز میں نغمہ سرا ہیں۔ پھول ہنس رہے ہیں اور کلیاں چٹک چٹک کر ساز بجا رہی ہیں، میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں اس طرح اس سے بہتر کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس معطر ہوا میں سانس لے رہا ہوں۔ ایسی گہری کوئی نہیں لے سکتا۔''

(روح ادب، صفحہ ۱۲۹)

جوش کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے مناظر قدرت بچپن سے رہے ہیں۔ کیونکہ کہ مجموعے کلام روح ادب ۱۹۲۰ء کی تخلیقات شامل ہیں۔ حالانکہ جوش کا سال ولادت

۱۸۹۴ء ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۶ کی عمر میں یہ لکھی ہے۔ یہاں تک جوش نے مناظر فطرت کے بہت سے رموز ونکات سے واقف ہوگئے تھے۔ فطرت کے یہی رموز ونکات ہم کو آپ کی شاعری میں ملتے ہیں۔

بہرحال جوش کا مناظر قدرت کی طرف فطری رجحان ہے۔ جوش کے اس رجحان میں رابندناتھ ٹیگور کے کلام نے اور بھی چمکا دی۔ اس فطرت پرستی کے جذبات کو رابندر ناتھ ٹیگور نے کافی اُبھارا ہے۔ جوش کے نظم میں ٹیگور کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ جس کا اعتراف جوش نے خود کیا ہے۔

"کبیر داس اور ٹیگور کی شاعری کا دلدادہ ہوں اور حافظ شیرازی کا پرستار۔"

(روح ادب، صفحہ ۱۱۱)

انھیں اسباب کی بناپر جوش ملیح آبادی کی منظر نگاری میں لطف وسُرور بھی ملتا ہے اور ساتھ ہی حقیقت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ اگر چہ اِن کی منظر نگاری میں تصوف کا اتنا گہرا اثر نہیں ہے کہ جتنا ٹیگور کے یہاں ملتا ہے۔ تاہم جوش کی منظر نگاری میں بھی کہیں کہیں عرفانیات کی جھلک موجود ہے۔

جوش ملیح آبادی مناظر قدرت کا مطالعہ سرسری یا تفریقی طور پر نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ جوش مناظر قدرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور ان کی تہہ تک پہونچ جاتے ہیں، جوش نے اپنی صلاحیت اپنی ابتدائی زندگی میں پیدا کر لی تھی۔ وہ اپنی نظم "ہماری سیر" میں فرماتے ہیں۔

شام کو سیر سے جب آتے ہیں لوگ ہنستے ہیں، چھپاتے ہیں

ہم پلٹتے ہیں جب گلستاں سے　　آہ بھرتے ہیں تھرتھراتے ہیں
میز پر سر سے پھینک کر ٹوپی　　ایک کرسی پہ لیٹ جاتے ہیں
آپ سمجھے یہ ماجرا کیا ہے　　جیسے ہم آپ کو سناتے ہیں

وہ لگاتے ہیں صرف چکر ہی
ہم مناظر سے دل لگاتے ہیں

(روح ادب، صفحہ ۶۲)

جوش اس نظم میں یہ کہتے ہیں کہ وہ مناظر سے دل لگاتے ہیں۔اردو شعرانے زیادہ تر اپنے ہی محبوب سے دل لگایا ہے۔لیکن جوش فطرت سے دل لگاتے ہیں دراصل اس فطرت سے دل لگانے والے شعرا اُردو شاعری میں بہت ہی کم ہیں۔

جوش ملیح آبادی بھی فطرت کے بہت بڑے پرستار ہیں۔اس لیے وہ فطرت کو نہایت عمیق نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔اس کی منظر نگاری کی نمایاں خصوصیت ان کی گہرا مشاہدہ ہے۔حُسن اتفاق سے جوش کو مطالعہ فطرت کا موقع بھی ملا ہے۔جوش ملیح آبادی کی پرورش ملیح آباد کے ایک محلّہ امانی گنج میں ہوئی ہے۔اس لیے اِن کی نظروں کے سامنے فطرت کی کھلی فضا موجود تھی۔جوش اس قدر مناظر کے شیدائی ہیں کہ جوش نے مناظر فطرت کے مشاہدہ کے لیے امانی گنج کے میدان میں ایک خاص طور سے مکان تعمیر کرایا تھا۔بہر حال جوش منظر نگاری کا مطالعہ براہِ راست کرتے ہیں۔ایک نظم میں جوش نے چڑیوں کی حرکات وسکنات کو نظم کیا ہے۔اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جوش کے سامنے کچھ چڑیاں موجود ہیں اور جوش ان کی مشاہدہ میں مصروف ہیں۔

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ

یو ں ہی پیاری چڑیو ابھی اور بھی گاؤ

پُھدک کر اِدھر سے اُدھر دوڑ جاؤ چہک کر اِدھر سے اُدھر پر ہلاؤ

چمک کر کبھی شاخ پر چہچاؤ اُچھل کر کبھی نہر پر گنگناؤ

یو ں ہی پیاری چڑیو ابھی اور بھی گاؤ

کبھی برگ تازہ کو منھ میں دباؤ کبھی کنج میں بیٹھ کر پھڑ پھڑاؤ

کبھی گھاس پر لوٹ کر دل لُبھاؤ کبھی جا کے بیلوں کو جھولا بناؤ

یو ں ہی پیاری چڑیو ابھی اور بھی گاؤ

(روح ادب، صفحہ ۶۷)

جوش کے یہاں منظر نگاری جانی پہچانی پائی جاتی ہے۔وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں۔اپنے تجربہ کے مطابق ہوتا ہے اِن کی منظر نگاری سے قارئین خود واقف ہوتے ہیں۔اس لیے جوش کی آواز عرب وعجم کی آواز نہیں معلوم ہوتی ہے۔بلکہ ہندوستان کی آواز معلوم ہوتی ہے۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں اِن کی منظر نگاری نہایت ہی دلکش ہے۔جوش فارسی شعرا کے بجائے ہندی شعرا سے قریب تر ہیں اور بعض مقامات پر تو اِن کے خیالات ہندی شعرا سے ٹکرا جاتے ہیں کیونکہ دونوں ہندوستان کے مناظر کی مصوری کرتے ہیں اس لیے جوش کی فطری شاعری کی بعض اوقات ہندی اُردو کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔اِن کی ایک نظم ''بھری برسات کی روح'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

جوش ملیح آبادی کی نظم ''بہار کی ایک دوپہر'' بھی مصورانہ شاعری کے لحاظ سے بڑی حد تک مکمل

ہے۔اس نظم میں بھی جوش نے منظر نگاری کی واضح تصویریں پیش کیا ہیں۔

بچپن ہیں ہوائیں بادل ہلکا ہلکا   بھڑیں چرا رہی ہیں دوشیز گان صحرا

کچھ لڑکیاں چنے کے کھیتوں میں گا رہی ہیں   کچھ پھول چُن رہی ہیں ساگ کھا رہی ہیں

بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے   کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے

خورشید بادلوں میں کشتی جو کھے رہا ہے   کوؤں کا بولنا تک اک لطف دے رہا ہے

کھیتوں پہ دھُندلی کرنیں چمک رہی ہیں

سرسبز جھاڑیوں میں چڑیاں پُھدک رہی ہیں

(شعلہ شبنم، صفحہ ۱۲۵)

جوش نے ''برسات کی ایک شام'' کی بھی مصوری کی ہے۔اور یہ شام منظر نگاری کے لحاظ سے بہت دلکش ہے۔نظم برسات کی ایک شام ملاحظہ ہو۔

خنک ہواؤں میں اُٹھتی جوانیوں کا خرام   کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام

فلک پہ بازی طفلا نہ ابر پاروں کی   ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی

ہر ایک ذرے میں ہیجان مست ہونے کا   ذرا سا ریل کی پڑی پہ رنگ سونے کا

شفق، ہلال، ندی، رنگ، ابر سبزہ ہوا   ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا

زمزمہ، امواج کی روانی میں   فلک پہ رنگ درختوں کے سایے پانی میں

فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چونچال

ہوا لطیف، زمین نرم، آسمان سیاں

(سیف وسبو صفحہ ۱۸۷)

مذکورہ اشعار کو بتانے میں جوش نے اِن مناظر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔اس نظم میں مقامیت بھی پائی جاتی ہے اس نظم کے بارے میں ڈاکٹر اختر اورنیوی بھی رقم طراز ہے

''جوش صرف ساکن تصویر کشی نہیں کرتے ، بلکہ محرک تصویر بھی بناتے ہیں۔شفق' چونچال' آسمان' سیال کے فقروں سے بدلتی ہوئی متحرک تصویر کشی گئی ہے۔''

(قدرو نظر،صفحہ ۱۸۳)

اس ایک نظم ''لو کی آمد'' قابل توجہ ہے۔گرمیوں کے موسم میں ہندوستان میں جو لُو چلتی ہے اس کے صیح نقشے جوش نے اپنی نظم میں پیش کیے ہیں۔

طے صبح کی راہ کر چکی ہے | دیواروں سی دھوپ اُتر چکی ہے
خنکی کی اُلٹ پلٹ ہی مسند | میدان میں ہے لو کی آمد آمد
آتی ہیں ہوائیں سنناتی | پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی
دوزخ میں بہشت ہے غزل خواں | شاخوں پہ چہک رہی ہیں چڑیاں
چو پائے ابھی ہانپتے ہیں | ہیبت سے درخت کانپتے ہیں
ہر سو ہیں رواں دواں ہوائیں | لرزاں ہیں طیور کی صدائیں
تھم تھم کے نکل رہے ہیں شعلے | انبار سے خشک پتیوں کے
تیزی سے ہوائیں آرہی ہیں | سن سن کی صدائیں آرہی ہیں

ہلکی سی فلک پہ کچھ گھٹا ہے　　خورشید ذرا سا چھپ گیا ہے

میدان بدل رہا ہے کیا روپ　　سایہ تھا ابھی ابھی کڑی دھوپ

پُر ہول ہوا کے ارغنوں ہیں　　آموں کے درخت سرنگوں ہیں

گھبرائے ہوئے ہیں باغ والے　　ہوجائیں کہیں نہ خشک تھالے

گرمی کی باڑھ پر جوانی

ہر ذرہ پکارتا ہے پانی

(شعلہ وشبنم،صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹)

اِن نظموں کا لب ولہجہ صاف بتا رہا ہے کہ جوش ہندوستان کے شاعر ہیں۔وہ اپنی نظموں میں انھیں باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو وہ خود دیکھتے ہیں۔جوش کی اس خوبی کا اظہار سردار جعفری نے بھی کیا ہے۔

''جوش کی فطری منظر کشی انیس اور اقبال، کی منظر کشی سے مختلف ہے اور میر حسن اور نظیر اکبر آبادی کی منظر کشی سے قریب ہے۔انیس کی منظر کشی تخیلی زیادہ تھی اقبال کے یہاں روایتی اثرات زیادہ تھے۔اور کلاسکی انداز تھا''ہمالہ'' والی نظم کا انداز کم ہوتا گیا۔اور اس جگہ''لالہ وگل'' اور ''سمن زار'' لیتے گئے لیکن جوش کی منظر نگاری میں ہندوستان پہچانا جاتا ہے۔جس میں بانس خوبصورت جھنڈ بھی ہیں۔ٹین کی چھتیں ہیں،جن پر بارش شور مچاتی ہے۔اور دھان کے کھیت ہیں۔پتوں کے دوتے اور

کوری سنکیں ہیں۔دریاؤں کے پُل ہیں ریل کی پڑیاں دیہاتی بازار،
مرچوں کی دھانس ،اور گڑ کی بھیلیاں ہیں اور کسانوں کے بیل اور ہل
ہیں۔جوہی اور بیلے کی کلیاں ہیں۔کوئلیں اور اس کی آوازیں ہیں اور یہ
منظر نگاری میر حسن سے زیادہ وسیع کی گئی ہے۔''

(ترقی پسند ادب،جعفری،صفحہ ۱۵۹)

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء-۱۹۴۸ء)

اختر شیرانی کے یہاں بھی منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔اس سلسلہ میں اختر کی وہ نظمیں بھی قابل قدر ہیں جو بچوں کے لیے کہی گئی ہیں۔آپ کی ایک نظم ''باغوں کی بہاریں''مصورانہ شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

گھنگھور گھٹائیں چھارہی ہیں برکھا کی ہوائیں آرہی ہیں
پودوں کو صبا ہلا رہی ہیں پھولوں پہ بہار آرہی ہیں
خاموش ہوائیں جاگ اُٹھیں موروں کی صدائیں جاگ اٹھیں
کویل کی بھی آرہی ہے آواز کل باغ پہ چھا رہی ہے آواز
جھرنے نے فسانہ اپنا چھڑا جھینگر نے ترانہ اپنا چھڑا

(باغوں کی بہاریں،صفحہ ۴۳)

مذکورہ اشعار میں باغ کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔یہ الفاظ نہایت ہی سادہ اور سلیس ہیں۔مبالغہ کا کہیں پتا نہیں معلوم ہوتا ہے۔اس میں باغ کے مناظر کے مختلف پہلو اپنی تصویریں پیش کرتا ہے۔

بچوں کی نظموں کے علاوہ اختر شیرانی کی وہ نظمیں بھی منظر نگاری کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں جن کو اختر نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اسی حوالے سے اِن کی ایک نظم ''تیتری'' ہے جس میں منظر نگاری کی مختلف تصویریں ہیں۔

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پرندہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوش گل میں یا کوئی نقش رسیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے — پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے — دامن کشیدہ ہے
ایک نو عروس کہ نگہِ انفعال ہے — شرم و صال ہے
یااک شعاعِ پر تو قوسِ و ہلال ہے — اور نومیدہ ہے
بچپن کا کوئی خواب ہی رقصاں فضاؤں میں — بدلی کی چھاؤں میں
بیتے ہوئے دنوں کا سماں ہے ہواؤں میں — اور غم کشیدہ ہے
اک خواب تو مصور رنگین طراز کا — صورت فراز کا
یا ایک مطربہ کے دل پُر گداز کا
لحنِ پریدہ ہے

(صبح بہار،صفحہ ۴۵)

نظم ''تیتری میں اختر شیرانی نے تیتری کو مختلف اشیاء سے تشبیہ دی ہے ان میں کچھ تشبیہات حسین ہیں۔اس کے باوجود اختر شیرانی اس نظم میں مصوری کا حق نہ ادا کر سکے۔بات ہے کہ اختر نے اس نظم

میں تخیل سے کام لیا ہے۔اور تخیل کی بلندی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اصل تیتری کی شکل نظر سے غائب ہوگئی ہے۔

اختر شیرانی کی منظریہ نظموں کا ایسا پہلو بھی بہت دلچسپی ہے کہ جس میں وہ فطرت کی مصوری کے سات ساتھ فطرت کے حسن سے بھی محفوظ ہوئے ہیں۔دراصل اختر شیرانی کی منظرکشی نظموں میں حسن ومحبت اور شباب وشراب کے عناصر موجود ہے۔ساتھ ہی وہ شبلی کی طرح فطرت کے پرستار اوراس کے دیوانے نظر آتے ہیں ۔ڈاکٹر محمد حسن نے فطرت پرستی کے بارے میں مندجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

''اختر شیرانی کے کلام میں فطرت کے زمزمے ملتے ہیں۔لیکن ان میں ورڑس ورتھ کی تعلیم نہیں ۔ ایک جمالیات پرست عاشق کی مثال ہے وہ فطرت کو استاد اور معلم کی طرح نہیں بال بکھرائے ہوئے نیلگوں پریوں کے حسین پیکر میں دیکھتا ہے۔''

(اردوادب میں رومانوی تحریک،صفحہ۵۸)

آپ کی ایک نظم'' برکھارت'' میں منظرنگاری سے لطف اندوزی کا جذبہ موجود ہے دراصل یہ اختر شیرانی کی فطرت ہے یہ نظم انھوں نے مسوری جاتے وقت کہی ہے۔اس نظم کو پڑھنے کے بعد لہجہ ولب بتا رہا ہے کہ اختر برسات سے کس قدر لطف اندوز ہورہے ہیں۔

آسمان پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم　　نو بہاروں کا ہجوم
آہ! رنگیں آوارہ نظاروں کا ہجوم　　کو ہساروں کا ہجوم

بدلیاں ہیں یا کسی کے بھولے بسر خواب ہیں　　بے خود و بتیاب ہجوم
یا ہوا پر تیرتا ہے رود باروں کا ہجوم　　آبشاروں کا ہجوم
پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹا ئیں اس طرح　　اور ہوائیں اس طرح
جھو متا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم　　بادہ خواروں کا ہجوم
نیلگوں پریاں اُفق پر پیر پھیلائے ہوئے　　بال بکھرائے ہوئے

یا اُمنڈ آیا ہے ساون کی بہاروں کا ہجوم

ابر پاروں کا ہجوم

(صبح بہار،صفحہ ۲۴)

اس نظم کے ہراک شعر برسات کے مناظر سے بے حد محفوظ رہا ہے۔اختر شیرانی نے اس نظم میں ترنم کا بھی خاصِ لحاظ رکھا ہے۔جس سے اس نظم کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔اس کے شاعری میں دو پہلو دوش بدوش چلتے ہیں۔ایک عورت کا عشق اور دوسرا فطرت کا عشق ہے۔

دراصل اختر شیرانی حسن کے پرستار ہیں۔وہ اِن مناظر میں کھو جاتے ہیں۔اختر شیرانی کو فطرت سے بے حد دلچسپی تھی وہ اس کے حسن پر مرتے ہیں اور مناظر کی حسین فضاؤں پُر سکون زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔اس بارے میں اردو کے مشہور ادیب پروفیسر آل احمد سرور نے اختر شیرانی کی فطرت پرستی پر مندرجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

''اختر کی جنت یوں تو سلمٰی یا ریحانہ یا عذرا کی آغوش ہے۔مگر اس جنت کی تعمیر میں فطرت کا حسن بھی ہے۔یوں بھی فطرت کے آغوش میں اختر

شیرانی کو سکون ملتا ہے۔ان کی جنت ارضی ہندوستان کی ایک بستی جو کہ دامن کوہ میں ہے۔ پہاڑوں کا پس منظر اس بستی کی عظمت اور تقدس کا ضامن ہے اس کے گرد ایک دریائے حسین لہراتا ہے جیسے حور کی گردن میں نور کی ہنسلی ہے دریائے زندگی کی روانی اور ایک مسلسل حرکت کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر وہاں پنگھٹ میں جھولے ہیں ۔دل چسپ اندھیاریاں ہیں ۔اورآم کی شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے ہیں۔تارے نور کے پیمانے ہیں اور چاند نور کی خوابیدہ پری ہیں۔''

(ادب اور نظریہ، صفحہ ۸۵، ۸٦)

اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں حسین مناظر کو پیش کیے ہیں۔آپ کی نظم ''نور جہاں'' کے ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

خدائی نیند میں سرشار ہے برکھا کا موسم
زمین شہدرہ پر ہر طرف کھویا سا عالم ہے

اُفق پر منتشر مہتاب کی سرشار لہریں ہیں
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندنی کی نہریں ہیں

ردائے آسماں میں ننھے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زریں کھل کھلاتے ہیں

چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
کہ پریوں نے کہیں موتی بکھیری پرستاں میں

رسیلی بو کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرووسوسن پر
نشہ کا سماں چھایا ہوا ہے سارے گُلشن پر

پرندے سو چکے ہیں جاکے اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں

خموشی کا سماں اِک ہُو کا عالم ہے زمانہ پر — سکون طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانہ پر

نہا کر آئی ہیں اندر کی پریاں عطر کے جل میں — نشے کی موجیں اُڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں

سکونِ شب سے ہیں ٹھہری ہوئی پانی کی نہریں بھی — کہیں گرائیوں میں سو چکی ہیں جا کے لہریں بھی

رو پہلی رات پر طاری ہے اندوجبیں کوئی — کہ گہری فکر میں لپٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی

یہ بھیگی رات یہ مستانہ رُت یہ نور کا عالم — زمرد فام نخلستاں پہ برقِ طور کا عالم

ہوا سے ننھی کرنیں کھیلتی ہیں شا خساروں پر

کہ کچھ چینی کی گڑیاں جُھولتی ہیں سبز تاروں پر

(نور جہاں، صفحہ ۴۷، ۴۸)

مذکورہ اشعار میں اختر شیرانی نے رات کی منظر نگاری کو بیان کیا ہے۔ چاندنی رات، تاروں کی چمک، پرندے کے آشیانوں، سنسان جنگل، پانی کی نہریں، بھیگی رات وغیرہ کا نقشہ نہایت واضح الفاظ میں کھینچا ہے۔ اس لحاظ سے اِن کی مصوری کامیاب ہے۔

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء)

فیض احمد فیض کی نظموں میں منظر نگاری، حسن اور احساس کی شدت عوام کے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ فیض نے اردو شاعری کو نئے الفاظ دیئے ہیں۔ ان کی نظموں میں منظر نگاری اُجاگر ہ مثلاً بہار، موسم، گل، صیاد، خزاں، شام صبح، سحر، گل چیں، شبنم، گل تر، زنجیر، قبا، آگ، مہتاب، فصل، دشت و دریا، زنداں، فراق، قافلہ، رقیب وغیرہ الفاظ اور پیکر نئے علامتی اور معنی و مفہوم پیدا کرتے

ہیں۔فیض احمد فیض الفاظ شناسی کے استاد ہیں۔ان کی شاعری اچھی روایت کے سرچشموں سے فیضاب ہوتی ہے۔انھوں نے اردو نظم نگاری کو معنوی وقار اور ظاہری حسن دیا اور نظم کو اس سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظموں کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔اس طرح نظم نگاری کی تحریک زور پکڑتی گئی۔اردو شاعری کی بساط پر فیض نے جیتے جی اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے اس بارے میں فضیل جعفری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''فیض کی شاعری کی زبان ان تمام ہم عصروں کی شاعری کی زبان سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔فیض کی نظموں کا مطالعہ ہمیں بلیک سر کے قول کی یاد دلاتا ہے کہ اچھے شعراء پہلے سے موجود زبان کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی تخلیق معلوم ہو۔

(چٹان اور پانی،صفحہ۲۷)

فیض نے اپنی ایک نظم ''تنہائی'' کے عنوان سے لکھی ہے۔اس نظم میں سوگواری اور اداسی کی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔اس نظم کے چند اشعار بھی دیکھئے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار

اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ

گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا وایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(نقشِ فریادی، صفحہ ۱۹۳)

اس نظم کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''پوری نظم کا ڈِکشن رومانیت اور غمِ جاناں سے مربوط ہے۔فیض کا احساس تنہائی اِس نظم میں افسردگی کا بھی حامل ہے یعنی کچھ تشویش اور ڈپریشن کا بھی عمل دخل مصرعوں سے زیادہ مصرعوں کے درمیان روشن ہے، جو طبعی یا oragnic ہے۔''

(فیض شناسی، صفحہ ۱۳۶)

اقبال اور جوش کی طرح فیض بھی ایک پیامی شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک کے میر کارواں ہیں اِن کی ابتدائی دور کی نظموں میں رومانی جذبات ملتے ہیں۔ان نظموں میں افسردگی اور غم کی جھلک کے باوجود تلخی، بیزاری اور شکست کی فضا ہے۔نقش فریادی کی ابتدائی نظموں '' خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو ''میں منظر نگاری کے نقش ہیں۔فیض کے دل میں مظلوم انسانوں کی ہمدردی کے جذبات صاف طور پر نظر آتے ہے۔وہ ایک ایسے عشق کے امین ہیں جو عام انسانوں کے درد کا احساس عطا کرتا ہے اور اہل زر کے مظالم پر ان کو اشکبار بناتا ہے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے

تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے

خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

کہ جنس عجز وعقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے

وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

(نقش فریادی، صفحہ ۲۰)

فیض نے اپنے فن کے تقاضوں کو ہمیشہ محفوظ اور ملحوظ رکھتے ہیں۔ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے مجازی عشق کو بھلا کر دنیا کے غم کو گلے لگایا۔اس لئے ان کی شاعری میں انقلاب اور ترقی پسند رجحانات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ترقی پسند تحریک میں شامل ہوکر اپنے دور کے حالات سے بھی مطمئن نہیں تھے۔وہ دولت کی مساوی تقسیم کے حامی تھی۔فیض احمد فیض چاہتے تھے کہ ایک غیر طبقاتی سماج قائم ہو۔وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہاں تھے جس سے یہ مقصد پورا ہو سکے۔وہ چاہتے تھے کہ محنت کش طبقے کو اپنا حق مل سکے اور ہر ایک شخص آسودہ زندگی بسر کر سکے۔یہی ان کے نظموں کا پیغام بھی تھا۔بقول آلِ احمد سرور:

> فیض کی زندگی کے حسن سے محبت اور اس کے پیچھے معنویت اور رمزیت کو پانے کی کوشش ان کے کلام کو وقیع اور برگزیدہ بناتی ہے۔اس کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔اِنسانیت کے اِس پرستار کی جتنی بھی قدر کی

جائے کم ہے۔ (فیض شناسی، صفحہ۲۲)

سماج میں پائی جانے والی نا آسودگی ، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس نے فیض کے ذہن کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ان اثرات سے اِن کے لہجے میں اداسی اور مایوسی پیدا ہوگئی یہی اثرات ان کے نظموں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔محبوب کے ساتھ ساتھ فیض کی شاعری میں غم روزگار بھی ہے اس غم سے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا ہوا ہے۔

فیض کے شعری مجموعوں ''دست صبا'' ''دستِ تہہ سنگ' اور ''سر وادئی سینا'' میں بھی بعض نظمیں ایسی ہیں۔جن کے موضوع عشقیہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی وسماجی ہیں۔''دستِ صبا'' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا جب وہ جیل میں تھے۔فیض احمد فیض کے جیل سے آنے کے بعد ان کا مجموعہ ''زنداں نامہ'' منظر عام پر آیا۔اس میں قید و بند کی یادگار نظمیں ہیں۔اِن کے اس مجموعے میں جو موضوعات ہیں ان میں احساسات کی شدت ہے۔فیض کی شاعری میں اعلیٰ مقاصد و بلند خیالات ملتے ہیں انہوں نے اپنی بعض نظموں سے مظلوموں کو تسلی دی ہے۔یہ خلوص انہیں سچائی کی وجہ سے حاصل ہوا۔بقول مجنون گورکھپوری۔

> ''فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں یکساں تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اور ان کے لئے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔''
>
> (فیض کی شاعری، صفحہ۴۰)

فیض کی شاعری میں تمثیل نگاری ملتی ہے۔آپ کی شاعری ترنم وموسقیت سے پوری طرح لبریز ہے۔اس کے علاوہ پرُ لطف تشبیہوں واستعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر کو تراشتے ہیں ۔ان کے موضوعات میں آفاقیت ہے۔ان کی ہمدردیاں بھی نہایت وسیع ہیں۔وہ اپنی شاعری میں لفظوں کا دلکش انتخاب کرتے ہیں۔

آپ کی خالص انقلابی نظموں میں موسقیت اور وزن کا اتار چڑھاؤ ہے جوکلام کو دلکش فن پارہ بنادیتا ہے۔فیض نے ایک نظم ''بول'' کے عنوان سے لکھی ہے۔جس میں یہ سارے چیزیں دیکھنے کوملتی ہیں ۔اس نظم کے اشعار کچھ اس طرح ہیں ؎

بول کے لب آزاد ہیں تیرے　　بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا　　بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکاں میں　　تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے　　پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے　　جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک　　بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(نسخہ ہائے وفا،صفحہ۸۱)

۱

اختر الایمان (۱۹۱۵ء-۱۹۹۶ء)

اختر الایمان اردو کے اہم نظم نگار شاعر ہیں۔دور حاضر میں نظم نگاری پر بحث کی جائے تو اختر الایمان کے بغیر بات اُدھوری ہے ۔اختر الایمان کی نظم نگاری اس دور کی ایک الگ پہچان ہے۔اُن کی نظموں کے چھ مجموعے،گرداب،تاریک سیارہ،سب رنگ،آبِ جو،یادیں،بنت لمحات،اور نیا آہنگ،منظر عام پر آ چکے ہیں۔یہی نہیں ہیں بلکہ اِن کی کلیات ''سروساماں ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا ،اس نے نظم کے اسلوب کوغزل کے اثرات سے آزاد کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔اور وہ سے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اِن کی ایک نظم ''تاریک سیاہ' جس میں منظر نگاری کی جھلک ہے۔نظم کے چند بند ملاحظہ ہو۔

آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پرورده بہاروں کی طرف دیکھو تو!
سب اسی ارضِ سیہ بخت کی خاطر ہیں یہ کھیل
خاک پرورده نظاروں کی طرف دیکھو!

(نظم تاریک سیارہ،صفحہ۷۸)

آسماں دور ہے اب خوابِ گراں سے اٹھیے
ظلمت شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمین بھی لیکن
اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرہ و تار

(نظم تاریک سیارہ، صفحہ ۸۰)

دراصل فطرت میں ایک زبردست تنظیم موجود ہے۔ بظاہر نظریں صرف اتنا دیکھتی ہیں کہ پہاڑ ۔دریا۔وادی۔ندی اور دیگر مناظر بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں۔مگر جن لوگوں نے نظام قدرت کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ ان سارے مظاہرات قدرت میں ایک غیر معمولی ربط قائم ہے۔کائنات میں وحدت' خوبی اور تناسب موجود ہے۔ یہ کائنات فن کا ایک حسین نمونہ ہے جس کو ایک ہوشیار اور فیاض خالق نے بنایا ہے۔ فطرت کی ساری تنظیم سے حُسن اور توازن ظاہر ہوتا ہے۔حُسن کا اظہار جس کو صداقت یا اشیاء کی فطرت کہتے ہیں فطرت کی تنظیم کے ذریعہ ہوتا ہے۔مثلاً فضائی حرکات جن کا مشاہدہ زمین اور سمندر میں کیا جاتا ہے،فطرت کی تنظیم کا ثبوت دیتے ہیں۔ پودا ۔پتی اور کلی کی نمو سے فطرت کی تنظیم پر روشنی پڑتی ہے۔

اردو کے شعراء نے بھی فطرت میں تنظیم کو محسوس کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مظاہر فطرت کی تنظیم کو سمجھنا بے حد مشکل ہے اگر ستاروں ہی کو دیکھیے تو بظاہر نہایت غیر منظّم انداز میں آسمان پر بکھرے ہوئے ہیں اسی لیے ایک بار غالب نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

''ستاروں کو دیکھو۔کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں۔نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مارسکتا۔''

(یادگار غالب، صفحہ ۴۵)

اس مقالے میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف انھیں شعرا کا کلام زیر بحث آئے جھنوں نے

منظر نگاری اس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی بھی منظر کی عکاسی کی گئی ہو۔ خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔ وہ شاعری جو ارضی فضائی اور بحری مناظر سے تعلق رکھتی ہے نیچرل شاعری کہی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر منظر نگاری کو ہم نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ سر سید نے نیچرل شاعری کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ شاعری جو خیالی نہ ہو فطری ہو نیز، جو تصنع اور آورد سے پاک ہو۔ سر سید کے ذہن میں نیچرل شاعری کا مفہوم یہی تھا کہ جو شاعری موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے فطرت کے مطابق ہو' اس کو نیچرل شاعری کہنا چاہیے چونکہ مولانا ۔ کچھ دانشوروں کی نظر میں مناظر قدرت اور وصف نگاری مترادف الفاظ نہیں در حقیقت وہ شاعری کی ایک مستقل صنف ہے۔ مناظر قدرت انسان کے دل میں مسرت' خوشی، خوف اور عبرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں صرف جذبہ انگیز چیزیں مثلاً چاندنی ۔ برسات ۔ بہار ۔ کوہ وصحرا اور قبرستان وغیرہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن وصف نگاری کو تحریک جذبات سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے بلکہ اس میں صرف موجودات عالم کی حقیقت یا ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کیے جاتے ہیں۔

منظر نگاری کے متعلق دور جدید کے نقادوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر بحث کی ہے انھوں نے ضمنی طور پر منظر نگاری کو بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد نے پہلی بار محسوس کیا ہے کہ ہماری اردو نظم نگاری میں جن مناظر قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے ان کا تعلق ہندوستان سے شروع ہوتا ہے اس طرح منظر نگاری کے متعلق کچھ خیالات ''آب حیات'' اور مجموعہ نظم آزاد'' کے دیباچے میں ملتے ہیں ۔ مولانا حالی نے بھی اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی بنیاد ڈالی اور ''مقدمہ شعر وشاعری'' لکھ کر فکر وشعور کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ انھوں نے نظم کے مختلف اصولوں سے

بحث کی ہے اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ شاعر کے لئے کائنات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے خصوصاً منظر نگاری کائنات کے مطالعہ کے بغیر صحت اور صداقت کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔منظر نگاری کے سلسلہ میں مولانا شبلی نے بہت اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے ''شعرالعجم '' جلد چہارم میں بتایا ہے کہ منظر نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا جائے۔مولانا شبلی نے تخیل اور محاکات کی حد بندی کی ہے اوردونوں کے دائرہ اختیار سے بحث کی ہے۔دراصل مولانا شبلی کے خیالات منظر نگاری کے سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔

منظر نگاری کے سلسلہ میں مولوی سید امداد امام کی تصنیف '' کاشف الحقائق'' جلد اول بھی بہت مفید ہے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ شاعری کی کیا خصوصیات ہیں اورمناظر قدرت کی عکاسی کے وقت کن اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔مولای عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف ''مراۃ الشعر'' میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ منظر نگاری کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ جس منظر کی تصویر کھینچی جائے اس کا ہو بہو نقشہ ہمارے ذہن میں اُتر آئے ۔مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف ''شعرالہند'' حصہ اول بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔انھوں نے یہ بتایا کہ نظم نگاری میں منظر کشی کے وقت ایسے الفاظ استعمال کرنا چاہیے جو مناظر قدرت کی عکاسی میں مدد دیں۔

منظر نگاری کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب نے لکھا ہے کہ منظر نگاری کے لئے صرف محاکات ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں تخیل کا بھی ہلکا سا رنگ ہونا چاہیے ۔کیونکہ اس طرح سے اصل منظر زیادہ دلکش ہوجاتا ہے۔پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کی دوسری تصنیف '' شاہکار انیس'' بھی ہم کو منظر نگاری کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔انھوں نے اس تصنیف میں اس نکتہ کو وضاحت کی ہے

کہ بعض اوقات میر انیس کے یہاں صبح غمگین ہونے کے بجائے مسرور کیوں نظر آتی ہے۔

مناظر قدرت میں صرف مناظر کا ذکر کیا جاتا ہے۔لیکن مادی اور غیر مادی بیانات میں فرق قائم کرنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مادی اشیاء کے بیان کے لیے وصف نگاری کا لفظ متعیّن کر لیں اور غیر مادی یا فطری مناظر کی مصوری کو 'مناظر قدرت' کے تحت رکھیں ۔اس طرح سے وصف نگاری اور مناظر قدرت کے درمیان حدفاصل قائم کی جاسکتی ہے ۔مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب مراۃ الشعرا میں لکھا ہے۔'وصف عام طور پر مناظر قدرت کی تصویر کو کہتے ہیں'۔

اردو کی نظمیہ شاعری عام طور پر دوحصوں میں تقسیم ہوتی ہے پہلا حصہ عالم خارج ہوتا ہے اور دوسرا عالم ذہن پہلے قسم کی نظم میں اکثر رزم ،بزم جلسہ ،جلوس،باغ ،تصور،چمن،گلزار،سبززار ،دریا، ہوا، بجلی،دن رات، چاند،سورج وغیرہ کے بیانات ہوتے ہیں۔یہ خارجی شاعری بھی ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

اردونظم کی بنیاد عالم خارج اور عالم ذہن دونوں سے وابستہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردونظم نیچرل شاعری میں ڈھل کر منظر نگاری سے پرکھی جاتی ہے۔مناظر قدرت کے بیان کے علاوہ فطرت کے ذی روح ہونے کا تصور جس میں غم اور خوشی شامل ہوتی ہے،نظم کی رونق بنتی ہے۔فطرت کے ذریعے صوفیانہ فلسفیانہ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ جو شاعر کرتا ہے وہ بھی منظر نگاری کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔

اردو نظم میں منظر نگاری تحقیقی اور تنقیدی جائزہ موضوع کے تحت،اس مقالے میں تحقیق کے اصولوں کے تحت جائزہ لیا گیا ہے اور وہ نیچرل شاعری جو مناظر قدرت کے بیان سے وابستہ ہوتی ہے اس کی

معنویت کو پرکھا گیا ہے۔اس پرکھ میں منظر نگاری کے کلیدی رول کو خاص طور پر اُجاگر کیا گیا ہے۔اردو نظم میں منظر نگاری سے متعلق اب تک کا یہ پہلا ایسا تجزیہ اور جائزہ ہے جو تحقیق وتنقید کے پہلو سے اردو ادب میں ایک نیا روشن دان ثابت ہوسکتا ہے۔ابھی تک اردو میں منظر نگاری سے متعلق جو کتابیں سامنے آئی ہیں اُن کی اپنی ادبی اہمیت ہے لیکن تحقیقی زاویہ سے زیر نظر مقالہ دلائل کے ساتھ پہلی بار سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔مذکورہ موضوع کو پانچ بنیادی ابواب میں منقسم کیا گیا ہے

پہلا باب: یہ باب منظر نگاری کی معنویت پر مشتمل ہے جس کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں منظر نگاری کی تعریف وتوضیح تفصیل بیان کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں منظر نگاری ابتدائی دور سے ہی جاری رہی ہیں جس کا سلسلہ شاعری کی جملہ اصناف میں ضرورتاً شعرا کرتے رہے ہیں لیکن اردو نظم میں اس کا باقاعدہ آغاز انجمن پنجاب کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں انجمن کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔

دوسرا باب: یہ باب اردو شاعری میں منظر نگاری سے متعلق ہے اس باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے شاعری اور منظر نگاری کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔پہلا حصہ ابتدائی دور سے متعلق ہے جس میں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے عہد سے غالب کی عہد تک مختلف شعری اصناف میں کی گئی منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس باب کے دوسرے حصے کو عبوری دور کا نام دے کر سرسید تحریک اور جدید نظم کی تحریک سے وابستہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں منظر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب: یہ باب اردو نظم کا آغاز وارتقاء ہے۔اس باب کے بھی دو حصے ہیں اردو نظم کے محرکات

اور ابتدائی نظم گوشعر۔اردو نظم کے محرکات ادب برائے زندگی رہے ہیں جسے انگریزی میں Practical life of poerty بھی کہہ سکتے ہیں۔اس تحریک کے رہنما سرسید احمد خان رہے جنھوں نے ادب میں نئے شعور کا اضافہ کیا۔نئے شعور کے باوجود اردو نظم میں منظر نگاری کا طور طریقہ روایتی رہا ہے جو سامع اور قاری دونوں کے ذوق کے مطابق جاری رہا۔

چوتھا باب: یہ باب اردو نظم میں منظر نگاری کی وضاحت سے متعلق ہے اس باب میں شعرا نے جو منظر نگاری کی ہے اس کی پرکھ، قدرت کی عکاسی اور فطرت کی عکاسی کے طور پر کی گئی ہے۔اس باب میں مناظر قدرت کی عکس بندی جس میں دن اور رات کا بیان اور موسموں کے زیر و بم خاص طور پر شامل ہیں اُجاگر کئے گئے ہیں۔

پانچواں باب: یہ باب اردو کے نمائندہ شعرا کی نظموں میں منظر نگاری کے عنوان سے ہے۔اس میں نظم کے جو نمائندہ شعرا ہمارے خاکے میں شامل کئے گئے ہیں اُن کی اہم نظموں میں منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔اِن شعرا کی تعداد بارہ ہے جو اس طرح ہے نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی ،سرور جہاں آبادی، اسمعیل میرٹھی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، نظم طبا طبائی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، اور اختر الایمان۔

اردو نظم میں منظر نگاری کا پھیلاؤ بہت وسیع ہے جس میں فلکیات کا مطالعہ بھی شامل ہے اور نباتات کا بھی۔منظر نگاری حیوانات اور مویشوں کے بارے میں بھی کی گئی ہے اور موسمیات کا مطالعہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔اردو نظم کے شعرا نے اپنی منظر نگاری کو اپنی فطرت کے دائرے کے قریب سے رکھا ہے اور قدرتی مناظر کو نظموں کی بنیاد زیادہ بنایا ہے اِن مناظر میں زمین ،فضا، سمندر، آسمان، سورج،

چاند، ستارے، بجلی، ہوا، آندھی، سمندر، طوفان، دریا، آبشار، موج، ساحل، پہاڑ، وادی، غار، میدان کھیت، باغ، گلشن، چمن، روش، پھول، پھل، کلیاں، سبزہ زار، جنگل، چٹان وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کے ابتدائی شعرا میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے، سودا اور میر کے قصیدے، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں ایسی نظمیں ہیں جو جدید اردو نظم نگاری کی عمارت کے لئے بنیاد بنی ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی سے ادب میں جو موضوعاتی نظمیں داخل ہوئیں ان سب میں منظر نگاری کی روایت اساتذہ کے بیان سے ہی روایتی طور پر منسلک رہی ہے۔

زیر نظر مقالے میں عہد بہ عہد منظر نگاری کی روایت کو اہم نظموں کے اقتباسات کے ساتھ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ مقالے میں اردو نظم اور منظر نگاری سے متعلق حوالہ جات کے لئے یوں تو میرے مطالعے میں تقریباً ایک سو پچاس کتابیں رہی ہے لیکن میں نے اس مقالے میں کتابیات کے عنوان سے صرف باون کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے میرا یہ مقالہ منظر نگاری کے حوالے سے اردو نظم شناسی میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوگا۔

کتابیات

	مصنف	کتاب	ناشر	اشاعت
۱	ابوالفضل، سید	تاریخ ادبیات عربی	سب رس گھر، حیدرآباد	۱۹۵۴ء
۲	الیس جہاں ڈاکٹر	اقبال بحیثیت شاعر فطرت	پرنٹنگ پریس، سرینگر	۲۰۰۱ء
۳	اخترالایمان	اردو نظم ۱۹۶۰ کے بعد	اردو اکادمی، نئی دہلی	۱۹۹۵ء
۴	انوری بیگم	قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ تہذیب	اردو کتاب دنیا، دہلی	۱۹۴۰ء
۵	امام فضل سید	شاعر آخر زمان	ماڈرن پبلیکیشن ہاوس، دہلی	۱۹۸۲ء
۶	اورنیوی اختر	قدر و نظر	ادارہ فروغ اردو، لکھنو	۱۹۵۵ء
۷	احتشام حسین سید	جدید شاعری	بک ہاوس، اورنگ آباد	۱۹۴۵ء
۸	اشرف الدین محمد	میرٹھی کی جدید نظمیں	سلمان فائن پبلیکشنز، دہلی	۱۹۷۱ء
۹	اطہر احمد	دکنی مثنویوں میں منظر نگاری	ادارہ اشاعت، حیدرآباد	۱۹۸۱ء
۱۰	اکبرالہ آبادی	کلیات اکبر	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۳۶۴ھ
۱۱	احمد کلیم الدین	اُردو شاعری پر اک نظر	اُردو مرکز، پٹنہ،	۱۹۵۲ء
۱۲	آزاد محمد حسین	نظم دل افراز نظم آزاد	ادارہ اشاعت، پنجاب	۱۸۹۹ء
۱۳	آزاد محمد حسین	سخندان فارس	حصہ دوم، مفید عام، لاہور	۱۹۰۷ء
۱۴	آبادی جوش ملیح	شعلہ و شبنم	ہمالیہ بک ہاوس نئی، دہلی	۱۹۹۷ء

۱۵	آزردہ محمد زمان	مرزا سلامت علی دبیر	بک ہاوس، سرینگر کشمیر	۱۹۹۶ء
۱۶	بلگرامی سید علی	تمدن عرب	مطبع شمس پبلیکیشنز، آگرہ	۱۸۹۸ء
۱۷	بریلوی عبادت	کلیات میر	اردو دنیا، کراچی،	۱۹۵۵ء
۱۸	ثناالحق	میر و سودا کا دور	ادراہ تحقیق و تصنیف، کراچی	۱۹۶۵ء
۱۹	جعفری فضیل	چٹان اور پانی	ہمالیہ بک ہاوس، اورنگ آباد	۱۹۷۴ء
۲۰	جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	مجلس ترقی ادب، لاہور	۲۰۰۸ء
۲۱	حالی الطاف حسین	مسدس حالی	راجہ کمار پریس، لکھنو	۱۹۷۹ء
۲۲	حالی الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری	لالہ رام نرائن، دہلی	۱۹۵۵ء
۲۳	حامد کشمیری پروفیسر	اردو نظم کی دریافت	ڈل گیٹ بک ہاوس، سرینگر	۲۰۰۴
۲۴	چغتائی حبیب رحمٰن	فیض کی شاعری	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۹۷ء
۲۵	رہبر، اجندر ناتھ	اردو نظم میں پنجاب کا حصہ،	کلیانت پرکاش، دہلی	۲۰۰۷ء
۲۶	سروری عبدالقادر	کلیات سراج اورنگ آبادی	سلسلہ یوسفہ، شمار نمبر ۵۔	۱۳۵۷ء
۲۷	مسعودراس سید	مرتبہ خطوط سرسید	نظام پریس، بدایوں	۱۹۳۱ء
۲۸	سندیلوی سلام	اردو شاعری میں منظر نگاری	آزاد بک ڈپو، لکھنو	۱۹۶۸ء
۲۹	سروری عبدالقادر	جدید شاعری	آزاد بک ڈپو امرتسر	۱۹۹۷ء
۳۰	شاہ فیصل	کتاب ایم، اے ایل اردو،	بک ہاوس، سرینگر کشمیر	۲۰۱۵ء
۳۱	شفیق رضازاد	تاریخ ادبیات ایران	الجمعتہ پریس، دہلی	۱۹۵۵ء

۳۲	شافع قدوئی	ساحر کے شعری امتیازات	ماہنہ آجکل بابت، جنوری	۱۹۹۶ء
۳۳	عبداللہ سید	مقامات اقبال	ادارہ اشاعت، لاہور	۱۹۵۹ء
۳۴	عبدالسلام	شعرالہند	مطبع معارف، عظم گڑھ	۱۹۳۹ء
۳۵	عبدالقیوم	تنقیدی نقوش	مشتاق بُک ڈپُو' کراچی	۱۹۶۳ء
۳۶	عبدالباری	مرتبہ،کلیات نظیر	مطبع تیج کمار' لکھنونولکشور	۲۰۰۲ء
۳۷	عابدی تقی ڈاکٹر	فیض شناسی	ادارہ سیاست، حیدرآباد	۲۰۱۳ء
۳۸	فیض احمد فیض	نسخہ ہائے وفا	پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۸۶ء
۳۹	فردوسی	شہاہ نامہ	نولکشور پریس، کانپور	۱۳۸۸ھ
۴۰	قادرزور محی الدین	کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ	مکتبہ ابراہیم پریس، حیدرآباد	۱۹۴۰ء
۴۱	کیفی حنیف	نظم معریٰ آزد نظم	جامیہ ملیہ اسلامہ، دہلی	۱۹۸۲ء
۴۲	نقوی، ناشر ڈاکٹر	اردو پنجاب اور سکھ شعراء	پبلیکیشن بیورو، پنجابی یونیورسٹی پیٹالہ	۱۹۹۹ء
۴۳	نقوی طلعت حسین	نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری،	ایجوکیشنل بک ہاوس، دہلی	۱۹۹۲ء
۴۴	نعمانی علامہ شبلی	موازنہ انیس و دبیر	لالہ رام پریس	۱۹۳۶ء
۴۵	لدھیانوی، ساحر	آؤ کوئی خواب بُنیں	مطبع پریس، نئی دہلی	۱۹۷۳ء
۴۶	میر انیس	مراثی انیس جلد اول	تج کمار بک ڈپو، لکھنو	۱۹۵۸ء
۴۷	منظر اعظمی	اردو میں تمثیل نگاری	ادارہ اشاعت، دہلی	۱۹۸۶ء
۴۸	محمد حسن، پروفیسر	مقدمہ دیوان آبرو	ادارہ التصنیف، علی گڑھ	۱۹۹۰ء

۴۹ مسیح الزماں، ڈاکٹر اردو مرثیے کا ارتقاء مطبع پریس، دہلی ۲۰۰۲ء

۵۰ منتظر جعفری سید مراثی انیس میں مناظر قدرت نشاط آفسٹ پریس، ٹانڈہ ۱۹۸۸ء

۵۱ ہاشمی نورالحسن دلی کی دبستان شاعری انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۴۹ء

۵۲ ہاشمی ایس۔ایم جدید اردو شاعری میں فیض احمد فیض انبات نفی پبلیکیشنز، کولکاتا ۲۰۰۹ء

اُردو نظم میں منظر نگاری، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

URDU NAZM MEIN MANZAR NIGARI, TEHQIQI AUR TANQIDI JAEZA

فیکلٹی آف لینگویجز پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی(Ph.D)اُردو

نگران:

پروفیسر ناشر نقوی

مقالہ نگار:

برکت علی نجار

(Established Under Punjab Act No 35 of 1961)

شعبۂ فارسی، اُردو و عربی

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

اگست۔۲۰۱۹

ماحصل

منظر نگاری اس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی بھی منظر کی عکاسی کی گئی ہو۔ خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔ وہ شاعری جو ارضی فضائی اور بحری مناظر سے تعلق رکھتی ہے نیچرل شاعری کہی جاسکتی ہے۔ اسی بنا پر منظر نگاری کو ہم نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرسید نے نیچرل شاعری کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ شاعری جو خیالی نہ ہو فطری ہو نیز، جو تصنع اور آورد سے پاک ہو۔ سرسید کے ذہن میں نیچرل شاعری کا مفہوم یہی تھا کہ جو شاعری موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے فطرت کے مطابق ہو'اس کو نیچرل شاعری کہنا چاہیے چونکہ مولانا ۔کچھ دانشوروں کی نظر میں مناظر قدرت اور وصف نگاری مترادف الفاظ نہیں درحقیقت وہ شاعری کی ایک مستقل صنف ہے۔ مناظر قدرت انسان کے دل میں مسرت' خوشی، خوف اور عبرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں صرف جذبہ انگیز چیزیں مثلاً چاندنی ۔ برسات۔ بہار۔ کوہ وصحرا اور قبرستان وغیرہ داخل ہوسکتے ہیں لیکن وصف نگاری کو تحریک جذبات سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے بلکہ اس میں صرف موجودات عالم کی حقیقت یا ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کیے جاتے ہیں۔

منظر نگاری کے متعلق دور جدید کے نقادوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر بحث کی ہے انھوں نے ضمنی طور پر منظر نگاری کو بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد نے پہلی بار محسوس کیا ہے کہ ہماری اردو نظم نگاری میں جن مناظر قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے ان کا تعلق ہندوستان سے شروع ہوتا ہے اس طرح منظر نگاری کے متعلق کچھ خیالات ''آب حیات'' اور مجموعہ نظم آزاد'' کے دیباچے میں ملتے ہیں ۔مولانا حالی نے بھی اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی بنیاد ڈالی اور ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر فکروشعور کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ انھوں نے نظم کے مختلف اصولوں سے

بحث کی ہے اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ شاعر کے لئے کائنات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے خصوصاً منظر نگاری کائنات کے مطالعہ کے بغیر صحت اور صداقت کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔منظر نگاری کے سلسلہ میں مولانا شبلی نے بہت اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے ''شعرالعجم '' جلد چہارم میں بتایا ہے کہ منظر نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا جائے۔مولانا شبلی نے تخیل اور محاکات کی حد بندی کی ہے اوردونوں کے دائرہ اختیار سے بحث کی ہے۔دراصل مولانا شبلی کے خیالات منظر نگاری کے سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔

منظر نگاری کے سلسلہ میں مولوی سید امداد امام کی تصنیف ''کاشف الحقائق'' جلد اول بھی بہت مفید ہے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ شاعری کی کیا خصوصیات ہیں اور مناظر قدرت کی عکاسی کے وقت کن اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔مولای عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف ''مراۃ الشعر'' میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ منظر نگاری کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ جس منظر کی تصویر کھینچی جائے اس کا ہو بہو نقشہ ہمارے ذہن میں اُتر آئے ۔مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف ''شعرالہند'' حصہ اول بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔انھوں نے یہ بتایا کہ نظم نگاری میں منظر کشی کے وقت ایسے الفاظ استعمال کرنا چاہیے جو مناظر قدرت کی عکاسی میں مدد دیں۔

منظر نگاری کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب نے لکھا ہے کہ منظر نگاری کے لئے صرف محاکات ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں تخیل کا بھی ہلکا سا رنگ ہونا چاہیے ۔کیونکہ اس طرح سے اصل منظر زیادہ دلکش ہوجاتا ہے۔پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کی دوسری تصنیف ''شاہکار انیس'' بھی ہم کو منظر نگاری کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔انھوں نے اس تصنیف میں اس نکتہ کو وضاحت کی ہے

کہ بعض اوقات میر انیس کے یہاں صبح غمگین ہونے کے بجائے مسرور کیوں نظر آتی ہے۔

مناظر قدرت میں صرف مناظر کا ذکر کیا جاتا ہے۔لیکن مادی اور غیر مادی بیانات میں فرق قائم کرنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مادی اشیاء کے بیان کے لیے وصف نگاری کا لفظ متعیّن کر لیں اور غیر مادی یا فطری مناظر کی مصوری کو 'مناظر قدرت' کے تحت رکھیں ۔اس طرح سے وصف نگاری اور مناظر قدرت کے درمیان حدفاصل قائم کی جاسکتی ہے ۔مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب مراۃ الشعرا میں لکھا ہے۔'وصف عام طور پر مناظر قدرت کی تصویر کو کہتے ہیں'۔

اردو کی نظمیہ شاعری عام طور پر دوحصوں میں تقسیم ہوتی ہے پہلا حصہ عالم خارج ہوتا ہے اور دوسرا عالم ذہن پہلے قسم کی نظم میں اکثر رزم ،بزم جلسہ ،جلوس،باغ ،تصور،چمن،گلزار،سبززار ،دریا، ہوا، بجلی،دن رات،چاند ،سورج وغیرہ کے بیانات ہوتے ہیں۔یہ خارجی شاعری بھی ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

اردو نظم کی بنیاد عالم خارج اور عالم ذہن دونوں سے وابستہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو نظم نیچرل شاعری میں ڈھل کر منظر نگاری سے پرکھی جاتی ہے۔مناظر قدرت کے بیان کے علاوہ فطرت کے ذی روح ہونے کا تصور جس میں غم اور خوشی شامل ہوتی ہے،نظم کی رونق بنتی ہے۔فطرت کے ذریعے صوفیانہ فلسفیانہ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ جو شاعر کرتا ہے وہ بھی منظر نگاری کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔

اردو نظم میں منظر نگاری تحقیقی اور تنقیدی جائزہ موضوع کے تحت،اس مقالے میں تحقیق کے اصولوں کے تحت جائزہ لیا گیا ہے اور وہ نیچرل شاعری جو مناظر قدرت کے بیان سے وابستہ ہوتی ہے اس کی

معنویت کو پرکھا گیا ہے۔اس پرکھ میں منظر نگاری کے کلیدی رول کو خاص طور پر اُجاگر کیا گیا ہے۔اردو نظم میں منظر نگاری سے متعلق اب تک کا یہ پہلا ایسا تجزیہ اور جائزہ ہے جو تحقیق وتنقید کے پہلو سے اردو ادب میں ایک نیا روشن دان ثابت ہوسکتا ہے۔ابھی تک اردو میں منظر نگاری سے متعلق جو کتابیں سامنے آئی ہیں اُن کی اپنی ادبی اہمیت ہے لیکن تحقیقی زاویہ سے زیر نظر مقالہ دلائل کے ساتھ پہلی بار سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔مذکورہ موضوع کو پانچ بنیادی ابواب میں منقسم کیا گیا ہے

پہلا باب: یہ باب منظر نگاری کی معنویت پر مشتمل ہے جس کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں منظر نگاری کی تعریف وتوضیح تفصیل بیان کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں منظر نگاری ابتدائی دور سے ہی جاری رہی ہیں جس کا سلسلہ شاعری کی جملہ اصناف میں ضرورتاً شعرا کرتے رہے ہیں لیکن اردو نظم میں اس کا باقاعدہ آغاز انجمن پنجاب کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں انجمن کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔

دوسرا باب: یہ باب اردو شاعری میں منظر نگاری سے متعلق ہے اس باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے شاعری اور منظر نگاری کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔پہلا حصہ ابتدائی دور سے متعلق ہے جس میں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے عہد سے غالب کی عہد تک مختلف شعری اصناف میں کی گئی منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس باب کے دوسرے حصے کو عبوری دور کا نام دے کر سرسید تحریک اور جدید نظم کی تحریک سے وابستہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں منظر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب: یہ باب اردو نظم کا آغاز وارتقاء ہے۔اس باب کے بھی دو حصے ہیں اردو نظم کے محرکات

اور ابتدائی نظم گوشعر۔اردو نظم کے محرکات ادب برائے زندگی رہے ہیں جسے انگریزی میں Practical life of poerty بھی کہہ سکتے ہیں۔اس تحریک کے رہنما سرسید احمد خان رہے جنھوں نے ادب میں نئے شعور کا اضافہ کیا۔نئے شعور کے باوجود اردو نظم میں منظر نگاری کا طور طریقہ روایتی رہا ہے جو سامع اور قاری دونوں کے ذوق کے مطابق جاری رہا۔

چوتھا باب: یہ باب اردو نظم میں منظر نگاری کی وضاحت سے متعلق ہے اس باب میں شعرا نے جو منظر نگاری کی ہے اس کی پرکھ، قدرت کی عکاسی اور فطرت کی عکاسی کے طور پر کی گئی ہے۔اس باب میں مناظر قدرت کی عکس بندی جس میں دن اور رات کا بیان اور موسموں کے زیر و بم خاص طور پر شامل ہیں اُجاگر کئے گئے ہیں۔

پانچواں باب: یہ باب اردو کے نمائندہ شعرا کی نظموں میں منظر نگاری کے عنوان سے ہے۔اس میں نظم کے جونمائندہ شعرا ہمارے خاکے میں شامل کئے گئے ہیں اُن کی اہم نظموں میں منظر نگاری کی نشاندہی کی گئی ہے۔اِن شعرا کی تعداد بارہ ہے جو اس طرح ہے نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی ،سرور جہاں آبادی، اسمعیل میرٹھی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، نظم طبا طبائی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، اور اختر الایمان۔

اردو نظم میں منظر نگاری کا پھیلاؤ بہت وسیع ہے جس میں فلکیات کا مطالعہ بھی شامل ہے اور نباتات کا بھی۔منظر نگاری حیوانات اور مویشوں کے بارے میں بھی کی گئی ہے اور موسمیات کا مطالعہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔اردو نظم کے شعرا نے اپنی منظر نگاری کو اپنی فطرت کے دائرے کے قریب سے رکھا ہے اور قدرتی مناظر کو نظموں کی بنیاد زیادہ بنایا ہے اِن مناظر میں زمین ،فضا، سمندر، آسمان، سورج،

چاند، ستارے، بجلی، ہوا، آندھی، سمندر، طوفان، دریا، آبشار،موج،ساحل، پہاڑ،وادی،غار،میدان کھیت، باغ،گلشن،چمن،روش، پھول،پھل،کلیاں،سبزہ زار،جنگل،چٹان وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کے ابتدائی شعرا میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے ،سودا اور میر کے قصیدے،میر حسن اور دیا شنکرنسیم کی مثنویاں ایسی نظمیں ہیں جو جدید اردو نظم نگاری کی عمارت کے لئے بنیاد بنی ہیں۔انیسویں صدی عیسوی سے ادب میں جو موضوعاتی نظمیں داخل ہوئیں ان سب میں منظر نگاری کی روایت اساتذہ کے بیان سے ہی روایتی طور پر منسلک رہی ہے۔

زیرِنظر مقالے میں عہد بہ عہد منظر نگاری کی روایت کو اہم نظموں کے اقتباسات کے ساتھ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔مقالے میں اردو نظم اور منظر نگاری سے متعلق حوالہ جات کے لئے یوں تو میرے مطالعے میں تقریباً ایک سو پچاس کتابیں رہی ہے لیکن میں نے اس مقالے میں کتابیات کے عنوان سے صرف باون کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔مجھے یقین ہے میرا یہ مقالہ منظر نگاری کے حوالے سے اردو نظم شناسی میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوگا۔